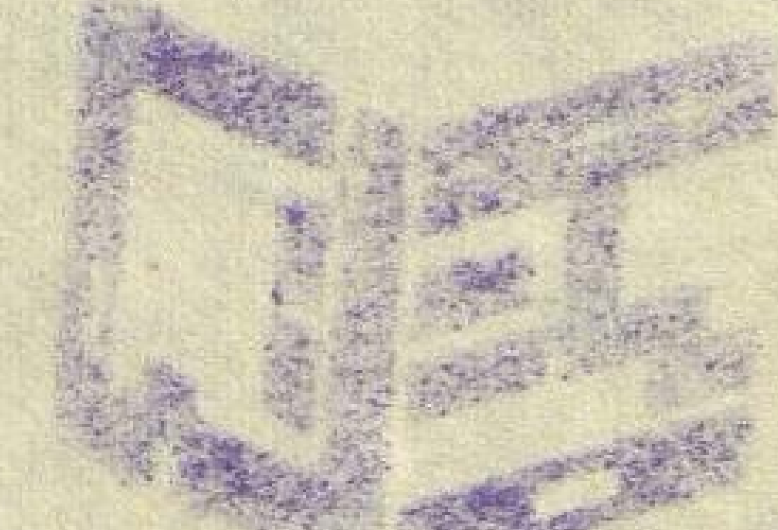
طنز و م

زاهد ملک

مطبوعاتِ حُرمت
بنک روڈ ۰ راولپنڈی



مثبت نتائج

طنز و مزاح

زاھد ملک

مطبوعاتِ حُرمت
بینک روڈ ○ راولپنڈی

طبع ——— سوم

تعداد ——— ایک ہزار

سرورق ——— انتظار حسین (کراچی)

کتابت ——— اقبال حسین

مطبع ——— ٹی ایس پرنٹرز۔ راولپنڈی

قیمت ——— ۲۵/- روپے

اپنے اُستادِ محترم

مرغوبؒ صدیقی مرحوم

کے نام

ترتیب

اعلانِ مصنّف

ہمیں علم ہے کہ ہمارے حاسد، جن کی کہ کوئی کمی نہیں، اور کوتاہ نظر ادبی نقاد، جن کی تعداد بھی کم نہیں زیرِ نظر کتاب کا کوئی نہ کوئی مقابلتاً کمزور پہلو تلاش کرنے کی کوشش کریں گے اور ممکن ہے وہ بالآخر بعض بظاہر نظر آنے والی غلطیوں کی نشاندہی کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو بھی جائیں۔ لیکن ہمیں یہ بھی علم ہے کہ جن صاحبِ ذوق لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے فراخ دلی، بصیرت اور مثبت طرزِ فکر سے نواز رکھا ہے انہیں اس تخلیق میں خوبیاں ہی خوبیاں نظر آئیں گی۔ لہٰذا اب اخبارات و رسائل میں شائع ہونے تبصروں، کتاب کی رونمائی کی تقریبات میں پڑھے جانے والے مقالوں اور قارئین کرام کی طرف سے موصول ہونے والی آرائ سے مصنّف کو یہ خود بخود اور ہمیشہ کے لئے معلوم ہو جائے گا کہ کون کس سانچے میں فِٹ آتا ہے۔

فرق آنکھوں میں نہیں فرق ہے بینائی میں
عیب بین عیب، ہنرمند ہُنر دیکھتے ہیں

زاہد ملک

پیش لفظ

زاہد ملک کا نام ہمارے تہذیبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ گزشتہ ربع صدی سے آپ صحافت اور تعلقاتِ عامہ کی دنیا میں سرگرم عمل ہیں۔ کاروباری اور تجارتی اداروں سے وابستگی، اطلاعات اور مذہبی امور کی وزارتوں کے اعلیٰ انتظامی فرائض کی بجا آوری، پاکستان نیشنل سنٹرز کی سربراہی اور "نوائے وقت" کے سے قومی اخبار کی ادارت کے دوران زاہد ملک نے پاکستانی زندگی کے جن مشاہدات، قومی مصائب و مشکلات کے جس شعور اور تہذیبِ نفس کے جس تجربے سے دیدہ و دل کو روشن کیا ہے اس کی ایک لطیف جھلک "مثبت نتائج" کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین میں نمایاں ہے۔ زاہد ملک نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز مزاح نگاری اور افسانہ نویسی سے کیا تھا مگر بہت جلد انہیں تعلقاتِ عامہ اور افسر شاہی کی کشش لے اڑی۔ اب جبکہ نگری نگری گھومنے اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے کے بعد زاہد ملک پھر ادبی دنیا میں وارد ہوئے ہیں۔ دل سے دعا نکلتی ہے کہ خدا انہیں اس دنیا میں قیام کا حوصلہ دے اور ان کی وہ تخلیقی صلاحیتیں جو بیوروکریسی اور صحافت کے گھاٹ اترنے سے بچ گئی ہیں ادب و فن کے کام آئیں۔

زاہد ملک اردو اور انگریزی ہر دو زبانوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اب

تک ان کی چار کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں جن میں سے دو انگریزی میں ہیں اور دو اردو میں۔ انگریزی تالیفات میں تقسیم پاکستان کے بعد کے پاکستانی مسائل اور عہدِ حاضر میں دنیائے اسلام کے مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے جبکہ اردو تصنیفات میں سقوطِ ڈھاکہ اور تعلقاتِ عامہ کے موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ "سقوطِ ڈھاکہ" کو اپنے موضوع پر اوّلین کتاب ہونے کا شرف حاصل ہے جبکہ "تعلقاتِ عامہ" بھی اردو زبان میں اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ "تعلقاتِ عامہ" ہماری یونیورسٹیوں میں صحافت اور تعلقاتِ عامہ کی اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں اساسی مطالعہ کی کتاب قرار پائی ہے۔

اس کتاب کا خیر مقدم کرتے وقت الطاف گوہر نے لکھا تھا کہ زاہد ملک کا :-

"اندازِ فکر مثبت اور ذمہ دارانہ ہے۔ ان کا اندازِ تحریر واضح اور پختہ ہے۔ انہوں نے فکری نتائج کو اپنے تجربے کی روشنی میں پرکھ کر دیکھا ہے۔"

اسی مثبت اور ذمہ دارانہ اندازِ فکر اور اسی واضح اور پختہ اندازِ تحریر کی دولت سے مالامال ہو کر زاہد ملک نے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کے میدان میں قدم رکھا ہے۔

زاہد ملک کے ہاں نہ تو بندھے ٹکے اور پیش پا افتادہ تفریحی موضوعات ہیں اور نہ ہی روایتی مضحک کرداروں اور سکہ بند فنی حربوں سے کام لیا گیا ہے۔ وہ نہ تو الفاظ کی بازیگری اور محاورات کے الٹ پھیر سے مزاح پیدا کرنے کے قائل ہیں اور نہ ہی لطیفوں اور چٹکلوں کی تجارت ان کا شیوہ ہے۔ وہ واقعہ اور خیال سے مزاح پیدا کرتے ہیں۔ اور ماحول کی بیدار اور بےباک ترجمانی اُن کا مسلک ہے۔ دردمندی اور انسان دوستی ایک زیریں رو کی طرح ان کے مضامین کے تار و پود میں جاری و ساری ہے۔ ہمارے جسدِ اجتماعی میں سرایت کی ہوئی اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی بیماریوں کو وہ شگفتہ

انداز میں بے نقاب کرتے اور لطیف طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ محض تفریح اور نرا تفنن اُن کی کل فنی کائنات نہیں۔ ان کے ہاں طنز و مزاح ایک سنجیدہ اصلاحی اور تعمیری مقصد کے تابع ہے۔ ہماری زندگی کا کھوکھلا پن، نمائش پسندی اور منافقت ان کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ وہ زراندوزی کی خاطر پیشہ ورانہ تقدس کو پامال کرنے میں مصروف ڈاکٹر ہوں یا دنیائے علم و دانش میں کھوکھلی شہرتوں کے علمبردار لوگ، بے بنیاد اخلاقی الزامات کی آڑ میں سیاسی کارکنوں کے جذبۂ آزادی کو سرد کرنے کے درپے انتظامی ادارے ہوں یا فرقہ آرائی اور علاقہ پرستی کو ہوا دینے میں کوشاں سیاستدان، کمنٹری کی افیون پلا کر کھیلوں میں حد سے بڑھے ہوئے انہماک اور تعمیرِ وطن سے غفلت کی عادت عام کرنے والے دانا دشمن ہوں یا گرانی اور نایابی کے مثبت نتائج سے فیض یاب ہونے والے نادان دوست ___ زاہد ملک کا قلم ہر کہیں جرأت اور بے باکی کے ساتھ مگر پُر لطف اور مسرت انگیز انداز میں تصنع اور فریب کا پردہ چاک کرتا ہے۔ زاہد ملک کے قومی احساس اور سیاسی شعور کی فن کارانہ جلوہ گری کی ایک مثال ملاحظہ ہو۔

"پاکستان ان دو چار خوش قسمت ملکوں میں سے ایک ہے جو مکھیوں کی دولتِ نایاب سے مالا مال ہیں بلکہ بعض اوقات تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس جس نسل اور جس جس ذات کی مکھی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں پائی جاتی ہو۔ یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ اور خاندانی سے خاندانی مکھی پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر پنجابی مکھیوں کا مکھی پن لاثانی ہے۔ پنجابی مکھی ہر بڑے اور خاص طور پہ دوسرے صوبوں کے بڑوں کی ناک پر بیٹھنے کی کوشش کرے گی اور اس پر فخر محسوس کرے گی لیکن پہچاننے والے پہچان جاتے ہیں کہ مکھی بالآخر مکھی ہے اس لئے وہ ان کے بھنکنے کو تو گوارا کر لیتے ہیں لیکن ان کی بھنبھناہٹ سن کر ان مکھیوں کو مکھی کی طرح نکال باہر کرتے ہیں۔ مگر پنجابی مکھی پھر بھی مکھی پہ مکھی

مارتی جاتی ہے۔ یعنی بے سمجھ مکھیوں کی پہلی نسلوں کی نقل کرتی چلی جارہی ہے نہ جانے اس کا یہ مکھی پن کب ختم ہوگا؟"

یہ اقتباس "آپریشن ماسکیٹو" سے لیا گیا ہے جہاں پنجابی، سندھی اور بلوچی مکھی کے خواص بیان کرتے وقت زاہد ملک نے قومی یکجہتی اور ملکی سالمیت کا شعور عام کرنے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ زاہد ملک کے فن کا ایک امتیازی وصف سیاسی حقائق سے شغف ہے۔ موضوع کوئی سا بھی ہو وہ پڑھنے والے کو ہنستے مسکراتے بالآخر کسی نہ کسی سیاسی حقیقت تک لے آتے ہیں۔ مثلاً "عاشقوں سے برادرانہ اپیل" میں وہ قومی اسمبلی میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف کے غیر جمہوری نزاع تک اور "آپریشن ماسکیٹو" میں چادر اور چار دیواری کے تحفظ کی دعویدار انتظامیہ کے کھوکھلے نعروں تک آ پہنچے ہیں۔ ایک ایسے زمانے میں جب ہمارے طنز و مزاح نگاروں نے سیاست کو دیس نکالا دے رکھا ہے گہری سیاسی طنز کے اس انداز کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے "مثبت نتائج" ہمارے طنزیہ اور مزاحیہ ادب کی گھٹی ہوئی فضا میں تازہ اور خوشگوار ہوا کا ایک جھونکا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ شگفتگی و انبساط اور خوش طبعی و زندہ دلی کو ترسی ہوئی اُردو دنیا زاہد ملک کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے پہلے مجموعے "مثبت نتائج" کا پُرجوش خیر مقدم کرے گی۔

فتح محمد ملک

قائد اعظم یونیورسٹی
اسلام آباد

۲۹ ستمبر ۱۹۷۹ء

مقدّس پیشہ

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر سو دوسو سال بعد اس زمین پر کوئی نہ کوئی ایسی طلسماتی اور عہد ساز شخصیت پیدا ہو جاتی ہے جو تاریخ کا دھارا موڑ کر رکھ دیتی ہے ایسی ہمہ پہلو شخصیات کو تقریباً تمام مروجہ علوم و فنون پر یکساں عبور حاصل ہوتا ہے۔ ہر ہر علم کی گہرائیوں اور باریکیوں پر اس حد تک ان کی باریک بین نظر ہوتی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ تاریخ ساز شخصیات بنیادی طور پر فلاسفر ہیں، ریاضی دان ہیں، ماہر فلکیات ہیں، طبیب ہیں یا ادیب ہیں۔ اب مثلاً ہماری طرف ہی دیکھئے بعض کوتاہ نظر لوگ ہمیں صرف ایک ادیب، صحافی، مورخ، ماہر تعلیم اور سیاستدان کی حیثیت سے جانتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو بصیرت عطا کر رکھی ہے اور وہ اپنے گرد و پیش سے باخبر رہتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہمیں فلسفہ، طب اور سائنس جیسے سائنسی مضامین پر بھی مکمل دسترس حاصل ہے۔ علم چھپائے نہیں چھپتا اور بالآخر سورج کی طرح عیاں اور روشن ہو کر رہتا ہے۔ اسی لئے عام طور پر ہم اپنی خوبیاں خود ہی بیان کرنا ضروری اور اچھا فعل نہیں سمجھتے اور جانتے ہیں کہ بھٹکے ہوئے لوگ اِدھر اُدھر کی ٹھوکریں کھانے کے بعد بالآخر

ہماری طرف ہی رجوع کریں گے۔ لیکن چونکہ ہم یہ مضمون ڈاکٹری کے مقدس پیشہ کے بعض پہلوؤں پر لکھنے لگے ہیں اس لئے ایسے ہی ہم نے سوچا کہ فنِ طب سے اپنے گہرے قلبی تعلق اور اعلیٰ پیچیدہ امراض ایکسرے آنکھ کے تشخیص میں اپنے وسیع تجربہ کا بھی سرراہ سرسری سا ذکر کر دیں۔

یہ اُس وقت کی بات ہے جب ہم بی اے کا امتحان دے چکے تھے اور امتحان کے نتیجہ کے انتظار میں دو تین ماہ کے لئے اپنے آبائی گاؤں میں مقیم تھے۔ ہمارے گاؤں کی آبادی دس بارہ ہزار کے قریب ہے۔ آس پاس کے چھوٹے چھوٹے دس بیس مکانی دیہات میں ہمارے گاؤں کو وہی مقام اور اہمیت حاصل ہے جو شہروں میں شہر کراچی کو حاصل ہے۔ اسی لئے تعلیم، کھیل کود، سیاست اور ثقافت وغیرہ میں ہمارے گاؤں کو مرکزی حیثیت حاصل ہے اور دوسرے دیہات کی نسبت یہاں روزگار کے مواقع بھی زیادہ ہیں۔ چنانچہ انہی دنوں ایک ڈاکٹر صاحب روزگار کی تلاش میں ہمارے گاؤں آ پہنچے اور انہوں نے چار کمروں پر مشتمل ایک مکان آٹھ روپے ماہانہ کرایہ پر حاصل کر کے اپنی پریکٹس شروع کر دی ہمیں جب گاؤں میں ڈاکٹر صاحب کی آمد کا علم ہوا تو ہم نے ان پر کال آن کا ارادہ کیا۔ ہم چونکہ خود صاحبِ علم آدمی ہیں اس لئے صاحبِ علم شخصیات سے دوستی عزیز رکھتے ہیں اسی خیال ہی سے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا ارادہ کیا۔ جونہی ہم ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچے ہمیں گوناں گوں روحانی مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ ہمارا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ڈاکٹر صاحب واقعی علم اور تجربے کا سمندر تھے۔ کرائے پر حاصل کئے گئے ان کے مکان + مطب کے باہر بورڈ پر لکھا تھا: "ڈاکٹر فضل الٰہی چشتی قادری ایل۔ ایم۔ سی، سی ڈے اے، کے ڈے اے، بی آر بی، کانفیڈنشل، پرائیویٹ، ماہر امراض مخصوصہ و خبیثہ" بورڈ کی آخری سطر میں لکھا تھا: "نیز ہر طرح کے دانت انگلی سے نکالے جاتے ہیں۔" بورڈ پڑھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ ہمارا فوری ردِعمل یہ تھا کہ یہ گاؤں کی خوش قسمتی ہی

ہے کہ ایک قابل اور تجربہ کار ڈاکٹر نے دکھی انسانیت کی خدمت کے لئے گاؤں کا رخ کیا ہے۔ مطب میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر صاحب ایک مریض کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ہمیں ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی سنجیدگی سے سٹیتھوسکوپ لگائے مریض کے دل کی دھڑکن جانچ رہے تھے۔ دل کے نازک علاقہ سے فارغ ہو کر انہوں نے سٹیتھوسکوپ مریض کی گردن، پھر گالوں، ماتھے اور سر کے مختلف حصوں پہ لگانا شروع کیا۔ مطب پر مکمل سکوت طاری تھا۔ صرف دیوار پہ لگے ایک بڑے سے گھڑیال کی ٹک ٹک کی آواز آ رہی تھی۔ سٹیتھوسکوپ کو مریض کے مختلف اعضاء کی سیر کرانے کے بعد انہوں نے اپنے ہم عمر گھڑیال کی طرف دیکھا اور گھڑیال کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی اپنا دایاں ہاتھ مریض کی نبض کی طرف بڑھایا لیکن ان کا نشانہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ انہوں نے مریض کی نبض کی بجائے اس لکڑی کی کرسی کے بازو کی نبض ٹٹول کر ایک جگہ پہ اپنی انگلیاں جما دیں جس پہ مریض بیٹھا ہوا تھا۔ پھر گھڑیال کی طرف دیکھتے دیکھتے ہی کہا "آپ کی نبض بالکل بند ہے۔ خیر کوئی بات نہیں چالو کر دیں گے"۔ کرسی کی نبض دیکھ چکنے کے بعد انہوں نے اپنا چشمہ اتار کر میز پہ رکھا اور اب مریض کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں پاکستان میں واحد ڈاکٹر ہوں جو مریض کے پاؤں سے لے کر سر تک ہر عضو پہ سٹیتھوسکوپ لگاتا ہے ورنہ عام ڈاکٹر صرف سینے اور کمر وغیرہ کا معائنہ کر کے ٹال دیتے ہیں۔ جب تک آپ مرض کو جڑ سے نہ پکڑیں اسے جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتے۔ میں اسی لئے بازاری سٹیتھوسکوپ پہ اعتبار نہیں کرتا اور اپنے اوزار خود تیار کرتا ہوں"۔ ہم نے غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعی سٹیتھوسکوپ قبلہ ڈاکٹر صاحب کا اپنا شاہکار ہے۔ سٹیتھوسکوپ کی نالیاں پودوں کو پانی دینے والی ربڑ کی کسی بوسیدہ ایک انچ موٹی ٹیوب سے تیار کی گئی تھیں۔ ایک نالی کا رنگ سرخ اور دوسری کا کالا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر مریض کی طرف قدرے جھک کر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا "بھائی صاحب آپ کے چاروں گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ ساری خرابیاں

اسی وجہ سے پیدا ہو گئی ہیں ۔ بہر حال آپ فکر نہ کریں ۔ میری دوائی سے آپ ایک ڈیڑھ مہینہ میں مکمل صحت مند ہو جائیں گے ،، یہ کہہ کر انہوں نے مریض کو مختلف مرتبانوں سے چودہ پڑیاں نکال کر دیں اور صبح و شام ایک ایک پڑی پانی کے ساتھ استعمال کرنے کو کہا ۔ مریض تشخیص سے اس قدر مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا کہ اظہار تشکر کی خاطر جھکا جھکا جا رہا تھا ۔ مریض نے بل کے متعلق پوچھا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا " بھائی صاحب ۔ کیسا بل اور کیسی فیس ؟ اگر مجھے دولت کا لالچ ہوتا تو لاہور یا کراچی پر یکٹس کرتا ۔ میں تو خدمتِ خلق کے لیے یہاں آیا ہوں اور ڈاکٹری کو مقدس پیشہ سمجھتا ہوں ۔ بہر حال آپ کے پیسے ہوئے چودہ اور پانچ انیس اور دو یعنی کُل مل ملا کر اکیس روپے " ڈاکٹر صاحب اکیس روپے والے مریض سے فارغ ہوئے تو اپنا زنگ خوردہ سٹیتھوسکوپ لے کر ہماری طرف بڑھے ۔ اُدھر سے ہم نے تعارف کے لئے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا ۔ ڈاکٹر صاحب نے سٹیتھوسکوپ کی ڈبی Chest piece ہماری ہتھیلی پر رکھنے کی کوشش کی اور کہا " اچھا پاؤں کے بجائے ہاتھ ہی سے مرض کی تشخیص کا آغاز کرتے ہیں " ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب ہم تو بس ایسے ہی آپ سے ملنے چلے آئے ہیں ۔ گاؤں میں بڑا چرچا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ میں شفا دی ہے اس لئے ہم نے سوچا کہ ہم بھی آپ کا دیدار کر لیں ۔ ویسے ہم مکمل طور پر صحت مند ہیں اور اگر ہمیں کوئی مرض ہے تو بس یہی کہ ہم اہلِ علم کے پرستار ہیں " ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور ریلیکس ہو کر بیٹھ گئے ۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلی ہی نشست میں نوّے منٹ کے قریب بات چیت ہوئی ۔ بات چیت میں ڈاکٹر صاحب نے زیادہ وقت گاؤں کے مختلف لوگوں کی مالی حالت کے متعلق متعدد سوالات کئے یا پھر علم طب میں ہماری گہری دلچسپی اور وسیع مطالعہ کے متعلق تبادلہ خیالات کیا ۔ قصہ مختصر یہ کہ ڈاکٹر صاحب سے ہماری دوستی ہو گئی اور ہمیں جب بھی دوسرے مشاغل سے فرصت ملتی ہم ڈاکٹر صاحب کے مطب جا بیٹھتے ۔ جلد ہی ہم نے ڈاکٹر صاحب کو ان کے مطب میں

آنے والے نئے نئے مریضوں کے امراض کی تشخیص میں مدد دینا شروع کر دیا۔ پھر کئی دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے زنگ خوردہ اور خود ساختہ سٹیتھوسکوپ کو مریض کے مختلف اعضا پر آزادانہ استعمال کرنے کے بعد کہا "بھائی صاحب آپ کے جگر میں گرمی ہے" لیکن ہم نے بغیر سٹیتھوسکوپ کے استعمال کے اپنی اعلیٰ خداداد مرض شناس صلاحیتوں کی بنا پر کہہ دیا کہ "ڈاکٹر صاحب میرے خیال میں مریض کے جسم میں دو دِل ہیں جس کی وجہ سے اس کا دورانِ خون بہت بڑھ گیا ہے۔" چنانچہ ڈاکٹر صاحب اکثر ہمارا ماہرانہ مشورہ مان لیتے۔ دو تین دفعہ یوں بھی ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے پاس کوئی سیریس کیس آ گیا تو انہوں نے ہمیں گھر سے بلا لیا اور کہا کہ ایمرجنسی ہے۔

کوئی ایک ماہ بعد خدا کا کرنا یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں ایک نئے آنے والے ڈنگر ڈاکٹر نے بھی فارغ اوقات بھی ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری کے مطب میں آنا جانا شروع کر دیا اور اس طرح ہمارے پینل میں ایک اور ماہر کا اضافہ ہو گیا اور اس کے بعد شاید ہی کوئی ایسا کیس ہو گا جو ہم تینوں سے بچ کر چلا گیا ہو۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مطب کے اوقاتِ کار از سرِ نو ترتیب دیئے۔ عام امراض والے مریضوں کو وہ صبح کے وقت اکیلے دیکھتے لیکن سیریس امراض یا بقول ان کے امراض مخصوصہ و خبیثہ والے مریضوں کو شام کے وقت ہم دونوں کی موجودگی میں دیکھتے۔ ہماری موجودگی میں جب کوئی مریض آتا تو ڈاکٹر صاحب حسبِ معمول اپنے سٹیتھوسکوپ کو مریض کے جسم کی سیر کراتے۔ پھر مریض کی نبض دیکھتے۔ پھر ٹکٹکی باندھ کر مریض کے چہرے کی طرف دیکھتے اور طرح طرح کے سوالات کرتے۔ سوالات میں وہ ایک یہ سوال ضرور پوچھتے کہ "آپ کے خاندان میں تو کسی کو یہ تکلیف نہیں" اگر کوئی بدہضمی کا شکار مریض بھی آ جاتا تو اس سے بھی پوچھتے کہ آپ کے خاندان میں تو کسی کو کسی وقت بدہضمی کی شکایت نہیں رہی؟ سوال جواب کے مرحلہ سے فارغ ہو کر وہ بغیر کچھ کہے ڈنگر ڈاکٹر اور ہماری طرف دیکھتے۔ ہم دونوں ماہرین سمجھ جاتے کہ اب

ڈاکٹر صاحب ہماری ماہرانہ رائے جاننا چاہتے ہیں۔ پہلے ڈنگر ڈاکٹر اپنے اینگل سے رائے دیتے اس کے بعد ہم علم طب میں ہونے والی نئی نئی دریافتوں کی روشنی میں مشورہ دیتے۔ جب کوئی بہت ہی مخصوصہ و خبیثہ امراض والا مریض آجاتا تو پھر ہم تینوں ماہرین ڈاکٹر صاحب کے آفس سے ملحقہ ایک دوسرے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں ایک گول میز کے اردگرد بیٹھ کر ایک گول میز کانفرنس کرتے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب حسب دستور بغیر کچھ کہے ہماری طرف دیکھتے۔ ایک مرتبہ اس طرح کی ایک گول میز کانفرنس میں ایک مریض کے مرض کی تشخیص کرتے ہوئے ڈنگر ڈاکٹر نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ میرے خیال میں اسے رانی کھیت (مرغیوں کی ایک عام بیماری) کا مرض ہے۔ چنانچہ متفقہ رائے سے اس مریض کا رانی کھیت کا ہی علاج کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب کی جو بات ہمیں سب سے زیادہ پسند تھی وہ یہ تھی کہ انہیں اپنے پرانے مریضوں کا بہت خیال رہتا تھا۔ ہر اتوار کی شام ہمیں اور ڈنگر ڈاکٹر کو لے کر وہ اپنے پرانے مریضوں سے ملنے قبرستان چلے جاتے اور کسی ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے اسے نمونیہ تھا میں نے نمونیہ کا علاج کیا یہ بالکل تندرست ہو گیا لیکن بعد میں فالج سے چل بسا۔ یہ بڑی قبر والا تپ دق کا مریض تھا میرے علاج سے تپ دق کا تو خاتمہ ہو گیا لیکن بعد میں یہ اپنی لاپرواہی سے مر گیا۔ پھر کسی بچے کی قبر کی طرف اشارہ کر کے کہتے کہ یہ بچہ بہت ہی لاغر تھا اسے سوکڑا تھا۔ میں نے اسے ایسے ٹانک دیئے کہ ہاتھی کا بچہ نظر آنے لگا لیکن بعد میں اس کا ہارٹ فیل ہو گیا۔ رات کو سویا تو اس کا ہارٹ کام کر رہا تھا، صبح اٹھا تو فیل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اسی طرح باری باری اپنے تمام پرانے مریضوں سے ملتے اور جب قبرستان سے واپس ہونے لگتے تو اپنی روائتی خدا ترسی اور مریض دوستی سے کام لیتے ہوئے کہتے " اچھا بھائی۔ جہاں رہو خوش رہو۔" اپنے مریضوں بشمول سابق مریضوں سے اس طرح کا پرسنل کانٹیکٹ (ذاتی رابطہ Personal contact) ہم نے کسی دوسرے

ڈاکٹر میں نہیں دیکھا۔ جس طرح ڈاکٹر صاحب کا مریضوں سے ایثار تو بے مثال تھا اسی طرح وہ اپنے مریضوں سے بھی توقع کرتے کہ ان کا رویہ بھی اپنے ڈاکٹر سے انتہائی فراخدلانہ ہونا چاہیئے۔ مریضوں کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا قول تھا کہ اچھا مریض وہ ہوتا ہے جو مرتے دم تک ایک ہی ڈاکٹر کو کنسلٹ Consult کرتا رہے۔

قبلہ ڈاکٹر صاحب کی دوسری بات جو ہمیں پسند تھی اور جو اب یہ مضمون لکھتے وقت بہت پسند آرہی ہے وہ یہ تھی کہ وہ خود اعلیٰ پایہ کے ڈاکٹر ہونے کے باوجود یا کی وجہ سے یہ ایم بی بی ایس قسم کے کتابی ڈاکٹروں کے بہت خلاف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ آج کل طرح طرح کے امراض اس لئے پیدا ہو رہے ہیں کہ اشیائے خورد و نوش میں ملاوٹ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ یہ بات سب ڈاکٹر اچھی طرح جانتے ہیں لیکن آج تک کسی بھی ڈاکٹر نے انفرادی طور پر یا پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن قسم کی ڈاکٹروں کی انجمنوں نے اجتماعی طور پر ملاوٹ کے خلاف کبھی کوئی مہم نہیں چلائی۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب کا کہنا تھا کہ یہ میڈیکل کالجوں کے پڑھے ہوئے "چھوکرے" مریضوں کو جو بظاہر مُہر بند اور ہوا بند قسم کی دوائیاں دیتے ہیں ان میں بھی ملاوٹ ہوتی ہے اور میرا بس چلے تو میں یہ تمام دوائیاں اور کیپسول وغیرہ سمندر میں پھینک دوں لیکن ڈر صرف اس بات کا ہے کہ غریب مچھلیاں مر جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب اکثر سوال کیا کرتے۔ آخر یہ ڈاکٹر ملاوٹ کے خلاف احتجاج کیوں نہیں کرتے؟ پھر خود ہی اپنے سوال کا اس انداز سے جواب دیتے جیسے اپنے آپ سے بات کر رہے ہوں "کبھی گورکن بھی لوگوں کے نہ مرنے کی دعا کر سکتا ہے"۔

ماضی کے ان واقعات کا ہم نے سرسری ساذکر محض اس لئے کر دیا تا کہ جن کوتاہ نظر حضرات کے علم میں اب تک یہ بات نہیں کہ علم طب پر ہمارے کیا کیا احسانات ہیں اور ہمیں مریضوں کو ہینڈل کرنے کا عملی تجربہ کس قدر حاصل ہے وہ بھی یہ بات جان لیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم خود کبھی بیمار نہیں پڑے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں۔ لہٰذا ہم بھی ایک دفعہ

بیمار پڑے تھے۔ یہ ۱۹۶۵ء کے اوائل کی بات ہے اور بیمار بھی ایسے پڑے کہ حقیقت یہ ہے کہ آج تک بیمار ہی چلے آ رہے ہیں اور شاید یہ ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری کے کسی پرانے مریض کی دعا کا اثر ہے کہ دن بدن ڈاؤن بھی جا رہے ہیں۔ اُن دنوں ہم وزارتِ اطلاعات و نشریات میں فائلوں کو اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کیا کرتے تھے۔ ایک دن دفتری اوقات میں ہمارے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ پہلے تو ہم نے سوچا کہ آج دل کے میٹھے درد کی لہر دل کے بجائے غلطی سے پیٹ میں جا اٹھی ہے گزر جائے گی لیکن نہیں۔ درد بڑھتا گیا جوں جوں انتظار کیا۔ چند ہی منٹوں میں ہم لوٹ پوٹ ہونے لگے۔ بیٹھیں تو شدید درد، کھڑے ہوں تو کاٹ دار درد، لیٹیں تو مزید لٹا دینے والا درد یعنی ہر حالت اور ہر صورت میں درد ہی درد۔ دفتر کے ساتھیوں نے سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال کی ایمبولینس منگوائی اور ہمیں ہسپتال کے ایمرجنسی روم میں لٹا دیا گیا۔ نیم بیہوشی کی حالت میں ہم دونوں ہاتھوں سے پیٹ پکڑے ہائے ہائے کرتے رہے۔ ایک نرس نے دوسری نرس کو آہستہ سے کہا "یہ تو میٹرنٹی کیس معلوم ہوتا ہے"۔ دوسری نے بھی سرگوشی کی "نواں مہینہ لگتا ہے"۔ پھر دونوں کی دبی دبی ہنسی کی آوازیں ہمارے کانوں کے پردوں سے ٹکرائیں۔ ان کا خیال تھا کہ مریض شدتِ درد سے نڈھال ہے جو چاہو کہو اور جو چاہو اس کے ساتھ کر لو۔ ہم بے شک درد سے لوٹ پوٹ ہو رہے تھے لیکن اتنے نڈھال بھی نہ تھے کہ زنانہ نرسوں کی موجودگی کا احساس نہ ہو لیکن ہم نے ان کی طنز کا جواب جان بوجھ کر نہ دیا کہ مبادا ہڑتال پر نہ چلی جائیں۔ ہمارے ملک میں ڈاکٹر اور نرسیں بات بات پر ہڑتال کھیلتی رہتی ہیں۔ ویسے بھی ہم ڈاکٹروں اور حجاموں کی ناخوشگوار باتوں پر کوئی ناخوشگوار ردِ عمل ظاہر نہیں کرتے۔ ہمارے ساتھ کئی دفعہ ایسے ہو چکا ہے کہ شیو کے دوران حجام کا میڈ اِن وزیر آباد Made in Wazirabad اُسترا ہماری گردن پر ہے اور ہم صاف دیکھ رہے ہیں کہ اس نے بعض بالوں کو اس بُری طرح جڑوں سے اکھاڑ دیا ہے کہ وہاں سے خون کے ننھے ننھے قطرے اُبل پڑے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے چہرے پہ خون کا پسینہ آ گیا ہے لیکن ہم

کہتے ہیں ماشاء اللہ کیا نرم ہاتھ ہے جیسے گگی (فاختہ) کے پَر سے شیو بنا رہے ہو. حجام کہتا ہے "بس جی اچھے کاریگر کی پہچان بھی کوئی کوئی کر سکتا ہے"۔ اسی طرح ہم اپنے ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب کی ہدایت کے مطابق ڈاکٹروں اور نرسوں سے بھی نہیں بگاڑتے۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ ڈاکٹر اگر مریض سے ناراض ہو جائے تو وہ مریض کو ایک اضافی مرض بن کر چمٹ سکتا ہے۔ خیر ہم اپنا پیٹ اور نرسوں کے حُسنِ اخلاق کے بارے میں اپنا ردِ عمل دبا ہی رہے تھے کہ اتنے میں ڈاکٹر آن ڈیوٹی آ گئے۔ انہوں نے آتے ہی درد کم کرنے کا انجکشن دیا۔ آنکھوں کی پُتلیوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا پیٹ کے مختلف حصوں کو دبا دبا کر ٹٹولا۔ دو چار سوالات پوچھے اور کہا کہ پیٹ میں السر ہے!! چنانچہ ہمارے السر کا علاج شروع ہو گیا۔ چونکہ ہمارا السر ہمارا نجی معاملہ تھا اس لئے ہم تفصیل میں نہیں جاتے کہ ہم نے پانچ چھ سال السر کے علاج کے لئے کیا کچھ نہ کیا۔ اُن دنوں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان صدرِ پاکستان تھے۔ ہم نے ان کے ذاتی معالج کو بھی کنسلٹ کیا۔ معالج صاحب نے پوچھا کیا معاملہ ہے۔ ہم نے کہا السر ہے۔ معائنہ کے بعد کہا "واقعی السر ہے"۔ اور اس کے بعد انہوں نے ہمارے زیرِ استعمال درجن بھر دوائیوں میں معمولی سا ردّ و بدل کر دیا لیکن ہر قسم کے علاج اور ہر ممکن پرہیز کے باوجود السر کے دائرہ کار میں معمولی سا بھی فرق نہ پڑا۔ ہر ماہ دو ماہ بعد پیٹ میں درد ہوتا۔ بعض اوقات قے بھی ہوتی۔ اِدھر اُدھر کا علاج کرنے سے درد کا زور ٹوٹ جاتا اور اس طرح یہ درد کا سائیکل پانچ چھ سال تک چلتا رہا۔ ۱۹۷۱ء میں ایک دن ہمارے پیٹ کے درد نے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔ پہلے جن دو نرسوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ اگر اُس دن موجود ہوتیں تو درد کی شدت اور پھیلاؤ دیکھ کر یقیناً کہتیں "اٹھارواں مہینہ لگتا ہے"۔ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے کہا کہ السر پھٹ گیا ہے۔ چنانچہ السر کو کاٹ پھینکنے کے لئے اپریشن کا دن اور وقت مقرر ہو گیا۔ ہم نے اپنے تمام عزیز و اقارب کو اطلاع بھجوا دی کہ جسے جسے آخری بار ملنا ہو آ کر مل لے۔ خدا

بھلا کرے کراچی کے نامور اور نیک سیرت سرجن مسٹر امان اللہ کا کہ اپریشن والی صبح انہوں نے کہہ دیا کہ مریض کے پتہ کا بھی ایکسرے کرا لیا جائے۔ پتہ کا ایکسرے کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارا غصہ ختم کرنے کے لیے پتہ کو سنگسار کیا ہوا ہے اور چھوٹی چھوٹی کنکریوں سے بھرا ہوا پتہ ڈاکٹروں کی زبان میں مردہ (Dead) ہو چکا ہے۔ اس مرحلہ پہ مزید چھان بین کے بعد معلوم ہوا کہ السر کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں بلکہ پتہ میں پتھروں کی وجہ ہی سے پیٹ میں درد ہوتا تھا اور اب پتہ کا ہی اپریشن ہوگا!!! چنانچہ سرجن امان اللہ نے پتہ کا ہی اپریشن کیا اور پتہ بمعہ پتھروں کے نکال کر ہمارے حوالے کر دیا اور یوں سات سال بعد ہمارا "السر" ختم ہو گیا۔

اپریشن سے ایک دن پہلے جب سرجن امان اللہ مختلف کمروں کا راؤنڈ لگاتے ہوئے ہمارے کمرے میں آئے تو ہم نے کہا ڈاکٹر صاحب اب جبکہ آپ ہمارا پیٹ کھول ہی رہے ہیں تو براہ کرم ہمارے گردے کلیجی اور دوسرے اعضا بھی اچھی طرح چیک کر لیں اور جو عضو بھی کمزور نظر آئے نکال دیں۔ ڈاکٹر صاحب مسکرائے اور کہا آپ مطمئن رہیں، میں پیٹ کے سارے کونے اچھی طرح دیکھ لوں گا۔ چونکہ طب ہمارا مضمون رہا ہے اس لئے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے ڈاکٹر صاحب سے اپریشن کے بارے میں کئی ایک سوالات پوچھے تاکہ اگر ہم محسوس کریں اور جہاں جہاں ضروری ہو سرجری کے موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی معلومات میں اضافہ کر دیں۔ مثلاً ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ اپریشن کے لئے کتنا پیٹ کھولتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہی کوئی چار پانچ انچ۔ ہم نے ان کی معلومات میں اضافہ کی خاطر کہا کہ اب بعض امریکی ڈاکٹر آٹھ نو انچ تک پیٹ کھول دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فوراً بولے لیکن میں پیٹ کے اندر جا کر نہیں بلکہ باہر کھڑا ہو کر اپریشن کرتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ اس موقع پر ہمیں اپنے پرانے کولیگ (ساتھی Colleague) ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری بہت یاد آئے۔ اگر یہاں اپنے ڈاکٹر صاحب ہوتے تو یقیناً

ہماری معلومات اور مشورے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور آٹھ انچ کیا وہ مریض کا پیٹ ایک فٹ تک بھی کھول سکتے تھے۔ بہرحال ہمارا اپریشن ڈاکٹری زبان میں، بڑا کامیاب رہا لیکن اپریشن کے بعد نہ جانے یہ کیا ہوا کہ سال دو سال کی ملازمت کے بعد استعفا دے دینے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ اپریشن کے بعد ہم اب تک تین چار ملازمتوں سے استعفا دے چکے ہیں۔

یہ تو تھا مختصر سا ذکر (ا) ہماری نسل کے بعض نمائندہ بیماروں کا (ب) ملک میں علاج معالجے کی سہولتوں کا (ج) نرسوں کے مریضوں کے ساتھ حسن سلوک کا اور (د) ڈاکٹروں کی قابل تعریف تشخیص کی اعلیٰ صلاحیتوں کا۔ اب اگر آخر میں اس نئی نسل کی صحت کا دو چار سطروں میں جائزہ لے لیا جائے جو آج کل سکولوں میں تعلیم پا رہی ہے اور جو آگے چل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالے گی تو مناسب رہے گا ہم مستقبل کے ان حکمرانوں کی صحت کی صورت حال اسی ایک مثال سے واضح کریں گے۔ مثال یہ ہے کہ ہمارے والد صاحب کے والد صاحب کے والد صاحب یعنی ہمارے پر دادا صاحب نے زندگی کی سو سے کچھ اوپر بہاریں دیکھیں۔ ساری زندگی انہوں نے آنکھیں چار نہیں کیں یعنی نظر کی عینک استعمال نہیں کی۔ ہمارے والد صاحب کے والد صاحب یعنی ہمارے دادا صاحب نے تقریباً اسی برس کی عمر میں وفات پائی اور عمر بھر ان کی بینائی و دانائی بغیر عینک کے بحال رہی۔ ہمارے والد محترم ماشاء اللہ اب ستر کے قریب ہیں البتہ پچھلے پانچ سالوں سے نظر کی عینک استعمال کرنے لگے ہیں۔ ہم خود اب تک زندگی کی بیالیس خزائیں دیکھ چکے ہیں البتہ پچھلے چھ سالوں سے عینک لگاتے ہیں۔ ہمارے ایک صاحبزادے یعنی نئی نسل کے ایک ہونے صاحب اس وقت آٹھ سال کے ہیں البتہ پچھلے سات سال سے نظر کی عینک استعمال کرتے ہیں۔ (اب ہمارے صاحبزادے کے اتفاق سے جو صاحبزادے پیدا ہوں گے وہ شاید عینک لگا کر پیدا ہوں گے) اور اس کے باوجود کبھی ایک کبھی دوسری آنکھ جھپکتے رہتے ہیں۔ ایک دن ہمارے صاحبزادے کی ایک میڈم نے ہمیں سکول بلوایا اور بڑی سنجیدگی سے شکایت کی کہ آپ کا بیٹا مجھے آنکھیں مارتا ہے۔ نہ جانے کس پہ گیا ہے؟

ہم نے میڈم سے افسوس کا اظہار کیا اور بتایا کہ "ویسے ہمارا بیٹا گیا تو ہم پہ ہی ہے لیکن ہم اسے ابھی بلا کر سمجھا دیتے ہیں۔" اس کے بعد ہم نے اپنے بے نور آنکھوں والے نورِ چشم کو بلا کر میڈم کی موجودگی میں ہی سمجھایا اور کہا کہ بیٹا کبھی اپنی میڈم کو آنکھ نہیں مارتے۔

ہم نے جس طرح بزرگ نسل، اپنی نسل اور نئی نسل کی بینائی میں جنریشن گیپ کی روشن مثال دی ہے اسی طرح ان کے دل و دماغ، دانتوں، آنتوں اور بعض دوسرے اہم اعضاء کی کارکردگی میں نمایاں فرق کے متعلق مثالیں دے کر ثابت کر سکتے ہیں کہ آنے والے دور میں یعنی سو دو سو سال بعد ہمارے بچوں کے ہاں چوزے ہی پیدا ہوا کریں گے۔ چوزوں سے بڑی کوئی چیز پیدا کرنا ان کے بس کی بات نہ ہوگی اور وہ چوزے بھی چند ابیٹری سیل سے ہی چلا کریں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہمیں آنے والی نسلوں کی صحت کی فکر نہ ہوتی اگر ملک میں ڈاکٹر فضل الٰہی صاحب چشتی قادری ایل ایم سی، سی ڈی اے، کے ڈی اے، بی آر بی جیسے ماہرین کی کمی نہ ہوتی۔ لیکن ایسی شخصیات کہاں روز روز پیدا ہوتی ہیں اور پھر اگر ایسے ڈاکٹر پیدا ہو بھی جائیں تو ڈنگر ڈاکٹر اور ہم جیسے کولیگز کہاں سے ملیں گے؟

تذکرہ دانشورانِ جدید

اب آپ سے کیا پردہ۔ ہم صاحبِ علم دانشور حضرات کی محفل میں بیٹھنے سے نہ صرف ہچکچاتے ہیں بلکہ گبھراتے بھی ہیں۔ دراصل ہمیں اپنی کم علمی کا بڑی شدت سے احساس رہتا ہے۔ حقیقت میں ہمارا سطحی سا علم یا غیر مکمل معلومات چند عام سے عوامی موضوعات تک محدود ہے۔ اس لئے ہمیں ان اہلِ علم اور اہل رائے دوستوں سے بات چیت کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ہمارے دوستوں میں ایک صاحب جو کسرِ نفسی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو تاریخ کا طالب علم کہتے ہیں دراصل تاریخ کے استاد ہیں اور ہر بات تاریخ کے حوالے ہی سے کرتے ہیں۔ کم علمی کی بناء پر ہماری حالت اس وقت دیدنی ہوتی ہے جب ہمارے یہ دوست بات کرتے کرتے ایک دم ہزار دو ہزار سال پیچھے چلے جاتے ہیں اور کہتے ہیں "ہاں وسطی یورپ بھی ایسے انتشار کا شکار ہو گیا تھا لیکن اس کے بعد یورپ جس طرح سنبھلا وہ آپ کے سامنے ہے۔" سچی بات یہ ہے کہ جب بھی اس طرح کی تاریخی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے ہمارے سامنے کچھ بھی نہیں ہوتا، بلکہ گفتگو کے آغاز سے پہلے جو کچھ ہمارے سامنے ہوتا ہے اب وہ بھی نظر نہیں آتا حتیٰ کہ

خود ہمارے مورخ دوست دھندلا دھندلا سے جاتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کس طرح تاریخ سے عدم واقفیت کے باوجود ہم اپنے دوست کی ہاں میں ہاں ملاتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔ جب اس طرح کی خالص علمی اور تاریخی بات چیت طول پکڑنے لگتی ہے تو ہم اکثر موسم کی بات شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں "توبہ۔ آج صبح ہی سے گرمی نے نڈھال کر رکھا ہے۔ سنا ہے کل موسم کا گرم ترین دن تھا" جواب میں ہمارے دانشور دوست کہتے ہیں "ملک صاحب۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ کل واقعی جھلسا دینے والی لُو چل رہی تھی۔ لیکن یہ کوئی نئی بات نہیں، تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ موسموں میں یہ اچانک تغیر و تبدل اور شدت مختلف عوامل کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔۔۔۔" تاریخی حوالوں کی دولتیوں سے بچنے کے لئے ہم سیاست کی بات شروع کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں "یہ ہمارے سیاستدان بھی عجیب ہیں۔ قوم کو مسلسل مایوس ہی کرتے چلے آرہے ہیں یہ کوئی اچھی بات تو نہیں"۔ اُدھر سے جواب آتا ہے "ملک صاحب۔ بے شک سیاستدانوں کا کردار مایوس کن ہے۔ لیکن آپ یہ بھی نہ بھولئے کہ بعض افراد اور ادارے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سیاستدانوں کی کردار کشی کر رہے ہیں۔ وہ سیاستدانوں کو ایک مذاق کا موضوع بنانا چاہتے ہیں اور لوگوں کو لفظ "سیاست" اور "سیاستدان" سے ہی مایوس کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن ایسے خفیہ ہاتھ تاریخ کے ہر دور میں سازشیں کرتے رہے ہیں۔ اب بنو عبّاس کا ہی دَور لے لیجئے۔۔۔۔" اب آخری حربے کے طور پر ہم مجبوراً کلائی پر بندھی اپنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہتے ہیں "اوہو۔ سات بج گئے۔ ہمیں تو ایک اور جگہ بھی جانا تھا۔ اچھا اب اجازت دیجئے"۔

اپنے عزیز دانشور دوستوں میں اردو ادب کے ایک نامور نقاد بھی ہیں۔ چونکہ اپنے دوست ہیں اس لئے مل لیتے ہیں، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ہم ان کی باتیں سُن کر حیران ہوتے ہیں کہ کوئی شخص اپنی مسلسل محنت اور لگن سے اس حد تک بھی معاملات پر عبور حاصل کر سکتا ہے لیکن ان کی صحبت میں جس مرحلہ پر ہم

فوراً گھرے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ مرحلہ نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار آجاتا ہے یعنی باتوں باتوں میں بات ادب تک جا پہنچتی ہے اور ہم ٹھہرے بالکل بے ادب۔ چند منٹ کی رسمی گفتگو کے بعد وہ پوچھیں گے "آپ نے میر درد کی شاعری میں حزن و یاس کے موضوع پر جو نئی کتاب آئی ہے پڑھی ہے؟ ہم اپنا سا منہ لے کر رہ جاتے ہیں لیکن اس خیال سے کہ کہیں ہماری علم و ادب سے لاتعلقی اور لاعلمی ہمیں دوستوں سے دور نہ کر دے کہہ دیتے ہیں "میر صاحب اچھے آدمی ہیں۔ ان سے حال ہی میں ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں لیکن افسوس انہوں نے بھی اس نئی کتاب کا تذکرہ نہیں کیا" اس پر ہمارے دوست ہنسنے لگتے ہیں اور ہم دل میں رونے لگتے ہیں کہ نہ جانے انہیں ہماری کس بات پہ ہنسی آئی ہے۔ ہم فوراً نسخہ نمبر ایک یعنی موسم کی بات شروع کر دیتے ہیں۔ چند منٹ کی گفتگو کے بعد وہ کہیں گے "میں اس بات سے بڑا ڈسٹرب ہوں کہ ہمارے ہاں ادب میں آفاقیت سے بڑا غلط مطلب لیا جا رہا ہے۔ ادب میں آفاقیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زمان و مکاں کے حدود سے بے نیاز ہوتا ہے" ہم کہتے ہیں "آپ نے بجا ارشاد فرمایا یہ زمان و مکان بہت ضروری چیز ہے ہم خود اس کو بہت اہمیت دیتے ہیں" اس کے بعد ہم نسخہ نمبر ۲ یعنی موجودہ اخباری سیاست پر بات شروع کر دیتے ہیں۔ دو تین منٹ کی گفتگو کے بعد وہ کہتے ہیں "..... یہ سمجھنے کے لئے ہمیں ماضی کی تاریخ کے حوالے سے ایک نیا تناظر فراہم کرنا پڑے گا" ہماری جانے بلا کہ یہ تناظر ہے کیا اور پھر یہ تناظر کس نے کس کو فراہم کرنا ہے اور اگر فراہم کرنا ہے تو کیونکر کرنا ہے۔ لیکن پھر یہ تاثر دینے کے لئے کہ ہم بھی ادبی ذوق رکھتے ہیں کہتے ہیں "پروفیسر صاحب۔ آپ کا کہنا بجا ہے لیکن موجودہ مہنگائی کے دور میں سب کے لئے نئے تناظر کہاں سے فراہم کئے جا سکیں گے۔ اور اس سلسلے میں کسی ایک صوبے کو بھی نظر انداز کیا گیا تو لوگ تناظر سے محرومی کو سیاسی رنگ دے دیں گے۔ لہٰذا ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ نئے نئے تناظر ڈھونڈنے اور فراہم کرنے کی بجائے

پرانے تناظر ہی سے کام چلائیں"۔ لیکن ہماری ایسی کھری اور دو ٹوک باتوں کو یہ دوست محض اپنے قہقہوں میں تحلیل کر دیتے ہیں۔

اپنے حلقے میں ایک دوست ایسے بھی ہیں جو ہر ہفتہ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاسوں میں جاتے ہیں اور وہاں ہونے والی اعلیٰ ادبی بحثوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ حلقہ کے سیکرٹری جب پچھلے ہفتہ کے اجلاس کی کارروائی پڑھتے ہیں تو پچھلی کارروائی میں حصہ لینے والوں میں سب سے پہلا نام ہمارے ان دوست ہی کا ہوتا ہے۔ ہاتھ میں ہر وقت کسی ممتاز ادبی مجلہ کا افسانہ نمبر لئے ہوتے ہیں اور مقامی ٹی ہاؤس میں نئے لکھنے والوں کے بخیے ادھیڑتے رہتے ہیں۔ ایک شام بڑا اصرار کر کے ہمیں بھی حلقہ کے اجلاس میں لے گئے۔ پہلے تو ہم معذرت چاہتے رہے کہ کسی اور کو وقت دے رکھا ہے لیکن وہ بضد رہے کہ آج ضرور چلیں۔ اچھی چیزیں پڑھی جائیں گی۔ کہنے لگے بیٹھیں ہماری موٹر سائیکل کے پیچھے اور پھر چٹکی بجاتے ہوئے کہنے لگے بس یوں گئے اور یوں آئے۔ مجبوراً ہم بھی چل دیئے۔ لیکن راستہ میں ادبی دانشوروں کی محفل میں بیٹھنے کے خوف سے پسینے آنے لگے اور سر بھی چکرانے لگا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم موٹر سائیکل کے بغیر ہی ہوا میں بیٹھے اڑے جا رہے ہیں۔ وہ تو بھلا ہو ہمارے دوست کی غیر محتاط ڈرائیونگ کا کہ ہمیں احساس ہونے لگتا کہ نہیں ہم تو موٹر سائیکل پہ بیٹھے ہیں اور حلقہ کے اجلاس میں جا رہے ہیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی محفل میں یہ ہماری پہلی نشست تھی۔ پسینے سے شرابور جسم تھر تھر کانپنے لگا۔ ہم تو اپنے محدود دوستوں کی کمپنی میں ایک دو ادبی صاحبان کا سامنا نہیں کر سکتے ہیں اور یہاں تو ہزاروں ادیب، شاعر اور ادب کے نقاد بیٹھے تھے (ممکن ہے شرکاء کی تعداد ہزاروں نہ ہو ذرا کم ہی ہو یعنی کل دس پندرہ دانشور ہی بیٹھے ہوں، لیکن نہیں ہمیں ہزاروں لوگ نظر آ رہے تھے) حلقہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ سیکرٹری نے پچھلے اجلاس کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ اس کے بعد س۔ش زخمی نے اپنا نیا افسانہ سنانا شروع کیا۔ عنوان تھا "پتھر کا کیڑا"۔ زخمی صاحب جوں جوں افسانہ پڑھتے گئے ہم یہی سمجھتے رہے کہ افسانہ میں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا

ذکر ہے کہ کس طرح رب نے پتھر کے کیڑے کو بھی رزق بہم پہچانا اپنے ذمّہ لے رکھا ہے۔
ہم نے طے کر لیا کہ اگر صدر صاحب نے بد قسمتی سے افسانہ کے متعلق ہماری رائے پوچھ لی تو ہم حاضرین کو متاثر کرنے کے لئے دریا کو کوزے میں بند کرتے ہوئے کہہ دیں گے کہ "یہ ایک خالص اسلامی افسانہ ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ صالح نوجوان نے قرآن پاک کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے" لیکن جب افسانہ ختم ہوا اور اشفاق شفقی صاحب نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک خوبصورت علامتی افسانہ ہے اور اس میں زمانے کی بڑھتی ہوئی ناانصافیوں، ناہمواریوں اور چیرہ دستیوں کو ایک نئے اور اچھوتے انداز میں دیکھا گیا ہے تو ہم نے دل میں کہا کہ یا اللہ یہ کیڑے کی چیرہ دستیاں کہاں سے آگئیں۔ ہم نے اپنے آگے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ ادیب کے پیچھے اپنے آپ کو مکمل طور پر چھپانے کی مزید کوشش کی تاکہ نہ صاحب صدر کو نظر آئیں اور نہ ہی وہ اس علامتی افسانہ کے متعلق ہماری رائے معلوم کریں۔ اتنے میں ایک دوسرے ادیب بولے۔ صاحب صدر یہ افسانہ دراصل دنیا کی محکوم قوموں کی فریاد ہے اور اس میں جدوجہد آزادیٔ فلسطین کی طرف بھی بڑے واضح اشارے ملتے ہیں..... تیسرے صاحب نے کہا "میرے نزدیک یہ ایک عام سا بے مقصد افسانہ ہے اور معلوم ہوتا ہے خود افسانہ نگار کا ذہن بھی صاف نہیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ویسے بھی یہ افسانہ ۱۹۳۲ء کے افسانوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا......" ہمارے چہرے پر عرقِ انفعال اب دھاروں کی صورت بہنے لگا۔ یا اللہ یہ کیا ماجرا ہے کہ افسانے نے اوپر بھی اٹھنا تھا لیکن ۱۹۳۲ء کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ اب کیا بنے گا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اجلاس سے کسی طرح بھاگ جائیں۔ سوچا پیشاب کرنے کے بہانے اٹھ جاتے ہیں اور پھر سیدھا گھر جا کر ہی پیشاب کریں گے۔ لیکن یہ کیا؟ ہم سیٹ سے اٹھ بھی نہیں سکتے۔ ہم نے پھر کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن جسم بالکل بے جان ہو کر رہ گیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ان ہزاروں حاضرین نے

ہماری ہی طرف نظریں گاڑھی ہوئی ہیں۔ افسانہ پر بحث تو محض ایک بہانہ ہے ورنہ ان سب کا مقصد محض ہمارا مذاق اڑانا ہے۔ ہم نے ہمت کر کے ساتھ والے صاحب سے کہا "باتھ روم"۔ مقصد یہ کہ ذرا ہٹ جائیں ہمیں باتھ روم جانا ہے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ ہم نے گھبراہٹ میں اس قدر بلند آواز میں "باتھ روم" کہا تھا کہ سب ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ صدر نے کہا "اچھا تو آپ کے نزدیک یہ افسانہ محض باتھ روم ہے۔ بہت خوب۔ لیکن آپ ذرا وضاحت کریں گے کہ آخر اس کومینٹ سے آپ کی مراد کیا ہے"؟

ہمارا سر مزید چکرانے لگا۔ یوں محسوس ہوا جیسے سب شرکاء حلقہ اور خود صاحب صدر بھی گھوم رہے ہیں۔ سب ایک گول دائرہ میں تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ ہم نے ٹکٹکی باندھ کر اور اپنی پوری قوت بصارت کو مجتمع کر کے صاحب صدر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک جگہ ہوتے تو ہم انہیں دیکھ سکتے وہ تو مسلسل گھوم رہے تھے۔ جس انداز اور رفتار سے صاحب صدر کی کرسی گھوم رہی تھی اسی انداز اور رفتار سے ہم نے اپنی گردن اور نظریں گھمانا شروع کیں تاکہ ان سے آنکھیں چار ہوں تو ابلاغ ہو سکے۔ اچانک ہمیں محسوس ہوا کہ ان کی کرسی چھت کے قریب جا کر ٹھہر گئی ہے۔ ہمارے کانوں میں آواز آئی "ہاں تو ملک صاحب۔ آپ کس طرح زخمی صاحب کے افسانہ "پتھر کے کیڑے" کو باتھ روم قرار دیتے ہیں"؟ نہ جانے ہم نے کس طرح کہہ دیا "دیکھیے صاحب۔ جہاں کیڑے ہوں گے وہاں گندگی بھی ہوگی اور کیڑے بالآخر پتھر کو باتھ روم بنا دیں گے"۔ کسی نے کہا واہ واہ عہد حاضر پر کیا خوبصورت طنز ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا ہمیں کچھ یاد نہیں۔ لیکن ہمارے دوست نے بعد میں بتایا کہ زخمی صاحب کے علامتی افسانہ پر آپ کا علامتی تبصرہ بڑا پسند کیا گیا تھا۔ سب نے آپ کے خیال کی تائید کی اور جس انداز سے آپ نے معاشرہ کی زبوں حالی پہ چوٹ کی اس پر سب نے تعریف کی۔ لیکن آپ اچانک تیزی سے اٹھ کر چلے کیوں آئے تھے؟

ہمارے صاحب علم دانشور دوستوں میں چوتھے صاحب ایک ریسرچ سکالر ہیں۔ انہوں نے مختلف اسلامی علوم اور بقول ان کے مختلف برانچوں کا گہرا مطالعہ کر رکھا ہے وہ کسی بھی بات کی تہہ تک پہنچنے کے لئے ایک ہی موضوع پر درجنوں کتابیں پڑھتے ہیں۔ پھر تاریخی حوالوں سے بات کرتے ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی پڑھتے ہیں۔ پھر کسی ملاقات میں خوشی سے بتاتے ہیں۔ "لو جی۔ فرانسیسی میں بھی ایک اور خوبصورت کتاب آگئی ہے ڈبلیو۔ آر۔ سمتھ نے لکھی ہے۔ وہی جس نے بوعلی سینا پر ایک چونکا دینے والی کتاب لکھی تھی"۔ ہم کہتے ہیں" بہت اچھا ہوا۔ ڈبلیو۔ آر۔ سمتھ اچھا لکھنے والا ہے اور اس میں سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ فرانسیسی ہو کر بھی فرانسیسی میں لکھتا ہے"۔ اور اس کے فوراً بعد نسخہ نمبر تین استعمال کرتے ہیں یعنی گھڑی کی طرف دیکھتے ہیں۔

ان صاحب علم دانشور دوستوں نے ہمیں سخت احساس کمتری میں مبتلا کر رکھا تھا (جی ہاں "تھا" یعنی یہ ماضی کی بات ہے اب ہم احساس کمتری میں مبتلا نہیں رہے) تو ہم کہہ رہے تھے کہ ہم اپنے دوستوں کی شور مچاتی ہوئی علمی و ادبی آبشاروں سے بڑے ہراساں تھے بلکہ ان سے چھپتے پھرتے تھے کہ ایک خبر نے ہماری کایا پلٹ دی۔ کایا کس طرح پلٹی وہ ہم بعد میں بتائیں گے۔ پہلے آپ بھی وہ خبر پڑھ لیں۔

"لندن میں پولٹری ریسرچ سینٹر نے اعلان کیا ہے کہ سائنسدانوں کی ایک ٹیم نے دس سال کی مسلسل ریسرچ کے بعد یہ معمّہ حل کر لیا ہے کہ بعض مرغیوں کے انڈے ٹوٹے ہوئے کیوں ہوتے ہیں۔ ایڈنبرگ سینٹر کے لئے کام کرنے والے ان ریسرچ سائنسدانوں نے کہا ہے کہ ہم بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ دراصل بعض مرغیاں کھڑی ہو کر انڈے دیتی ہیں اور چونکہ ان کی ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں اس لئے انڈے زمین پر گر کر ٹوٹ جاتے ہیں"۔

ان ریسیرچ سائنسدانوں کی دس سالہ محنت کے دور رس نتائج سے نہ جانے کیوں اور
کیسے ہم پر یہ واضح ہوا کہ اس طرح کی گہری ریسیرچ کر کے ہم بھی بعض ایسے انکشافات کر
سکتے ہیں جس سے بنی نوع انسان کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور آنے والی نسلیں ہمارے
عظیم احسانات کے اعتراف کے طور پر گلی گلی اور کوچے کوچے میں ہمارے ایسے مجسمے
بنا کر نصب کر سکتی ہیں جن میں ہمیں گھوڑے پر بیٹھا دکھایا گیا ہو۔ گھوڑے کے دونوں اگلے
پاؤں ہوا میں اٹھے ہوئے ہوں، گھوڑا ہنہنا رہا ہو اور ہمارے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے
میں کتاب دکھائی گئی ہو۔ چنانچہ ہم نے اپنے اندر اس اچانک تبدیلی اور اپنے مصمم
ارادے کا ذکر اپنے حلقے کے پانچویں دوست سے کیا جو ایک ممتاز صحافی ہیں۔ انہوں
نے حسب معمول بتایا کہ "یہ سب چکر ہے"۔ ہماری گزارش پر انہوں نے اس "چکر" کی وضاحت
یوں کی کہ جس طرح اس خبر میں ریسیرچ سائنسدانوں نے گورنمنٹ اور عوام کو چکر دیا ہے اسی
طرح یہ سب لوگ جن سے آپ اپنے بقول اپنی کم علمی کی بنا پر الرجک رہتے ہیں چکر دیتے
ہیں بلکہ خود بھی چکر ہی چکر ہیں۔ ہمارے جہاندیدہ دوست نے بزرگانہ انداز میں نصیحت
کی کہ زندگی میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ آپ بھی ان چکروں کو چکر دیں اور اس
طرح اور اس انداز سے چکر دیں کہ خود ان کے سر چکرانے لگیں۔ ہمارے زیرک دوست نے
چکروں کو چکر دینے کا عملی مظاہرہ کر کے بھی دکھایا۔ اور کہا کہ "جب آپ سے کوئی کہتا ہے
کہ اپنے ڈبلیو۔ آر سمتھ کی نئی کتاب مارکیٹ میں آگئی ہے تو کیا کوئی صاحب اس کی تردید
کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں؟ نہیں۔ نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ سمتھ نامی
کوئی صاحب فرانس میں پائے بھی جاتے ہیں یا نہیں۔ یا جب کوئی ادیب کہتا ہے کہ فلاں
افسانہ ۱۹۳۲ء کے افسانوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا تو کوئی ٹوکتا ہے کہ نہیں صاحب
یہ افسانہ نومبر ۱۹۵۷ء کی سطح کا ہے"۔ بزرگ دوست نے یہ بھی بتایا کہ جب کوئی ہر بات
میں تاریخی حوالے دیتا ہے یا دو تین ہزار سال پیچھے چلا جاتا ہے تو اس کی بات ہر سننے والا

اس لئے مان جاتا ہے اور متاثر ہو جاتا ہے کہ کہ انہوں نے تاریخ پڑھی نہیں ہوتی۔ اصل میں تاریخی حوالے دینے والے نے بھی کوئی زیادہ تاریخ پڑھی نہیں ہوتی لیکن چار پانچ حوالہ جات یاد کر لیتا ہے اور دوسروں کو چکر میں ڈال دیتا ہے۔ ادبی نقاد بھی چند مخصوص الفاظ اور ذومعنی پُر پیچ فقرات کے دو دھاری نشتر سے ادبی تخلیقات کا پورسٹمارٹم کرتا رہتا ہے۔ ہمارے بزرگ دوست نے ہمارے اور قریب آکر رازدارانہ انداز میں آہستہ سے کہا اگر آپ بھی تھوڑی سی ریاضت کر لیں اور اس منافع بخش کاروبار کے رہنما اصولوں کو جان جائیں تو آپ بھی شرفاء کو ہراساں کر سکتے ہیں۔

ان سنہری ہدایات پر عمل کر کے اب ہماری کایا پلٹ چکی ہے۔ لوگ دھڑا دھڑ ہمارے علم سے مرعوب ہو رہے ہیں۔ صورت حال میں اس انقلابی اور ڈرامائی تبدیلی کو ہم قارئین کی آسانی کے لئے ایک فلمی مثال سے واضح کریں گے۔ ہم نے ایسی کئی فلمیں دیکھ رکھی ہیں جن میں ہاف ٹائم سے پہلے ہیرو بہت ہی بزدل بلکہ بدھو دکھایا جاتا ہے۔ ان میں ایک پنجابی فلم ایسی بھی تھی جس میں شر پسند ولن اور اس کے منہ زور آوارہ ساتھی ہیرو کے سامنے ہی اس کی الہڑ ہیروئن کو اٹھا کر لے جاتے ہیں، ہیرو چارپائی کے نیچے گھس جاتا ہے اور تھر تھر کانپتا ہے حالانکہ ولن اینڈ کمپنی اس کو اٹھانا بھی نہیں چاہتے۔ ظاہر ہے کہ اسے اٹھا کر کریں گے بھی کیا۔ ہیروئن چیختی ہے چلاتی ہے اور کہتی ہے "وے شیریا۔ چوہدری تیری عزت نوں تار تار کرنا چاہندا اے تے توں منہ چھپاندا پھرنا ایں۔ وے منہ چھپان دا ویلا تے اس وقت آئے گا جدوں عزت تار تار ہو جائے گی"۔ لیکن ہیرو پر کوئی اثر نہیں ہوتا پھر اچانک ہاف ٹائم کے بعد ہیرو واقعی ہیرو بن جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ولن کا کسی موڑ پر ہیرو سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے۔ ولن مونچھوں کو تاؤ دے کر بڑک مارتا ہے اور ہیرو کی سابقہ بزدلی کی روایات کے پیش نظر اس سے چھیڑ خانی کرتا ہے لیکن ہیرو کہتا ہے "اوے۔ کلمہ شہادت پڑھ لے تے اپنی ماں نوں کہہ دے وَین شروع کر دے

تینوں تیری موت ایتھے لے آئی اے۔" اور اس کے بعد ولن کا ہی کوڑا چھین کر اس کی وہ پٹائی کرتا ہے کہ ہال میں دس بارہ منٹ کوڑوں کی ٹھاہ۔ ٹھاہ کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں بچے خوشی سے تالیاں بجاتے ہیں اور نیک سامعین و ناظرین دل میں کہتے ہیں کہ بے شک بدی کا انجام بُرا ہی ہوتا ہے۔

آج کل ہمارا حال بھی اس اچانک بدل جانے والے ہیرو جیسا ہے۔ کسی جگہ اپنے مورخ دوست سے آمنا سامنا ہو جاتا ہے تو ان کے ہاتھ میں تاریخ کی ایک کتاب نظر آتی ہے جبکہ ہمارے ہاتھ میں دو کتابیں ہوتی ہیں۔ ابھی وہ اپنے علم کا مظاہرہ کرنے کے لئے کہتے ہی ہیں کہ "اس وقت پاکستان کی سیاسی صورت حال میں جو انتشار ہے تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی سوائے ....." ہم فوراً ٹوک دیتے ہیں "حضور مثال کیوں نہیں ملتی۔ ابتدائی یونان کی تاریخ پڑھ لیں۔ اپنی اسلامی تاریخ پڑھ لیں یا کوئی اور۔ ایسی درجنوں ریاستوں کا ذکر مل جاتا ہے جن کے کل کیا آج کی سالمیت کی خبر نہ ہوتی تھی اور یہی حال آج کل افریقہ کے بعض ممالک کا ہے بلکہ ہمیں تو یہاں تک علم ہے کہ کل ہی مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کے وزیر خارجہ نے اپنی پارلیمنٹ کے ایک خفیہ اجلاس میں کہا ہے کہ ہمارے وجود کو اس حد تک خطرہ لاحق ہے کہ کل کی کوئی خبر نہیں ....." جب بات چیت دو چار منٹ اس انداز میں چلی تو ہم نے محسوس کیا کہ ہمارے دوست کچھ چکرانے لگے۔ فوراً کہنے لگے "آج عجیب و غریب موسم ہے نہ گرمی نہ سردی" ہم نے دل میں کہا قبلہ ابھی تو آپ کو دن میں تارے نظر آئیں گے۔ اسی طرح چند دن پیشتر ہمارے نقاد دوست مل گئے پیشتر اس کے کہ وہ بات کو گھما پھرا کر ادب پر لاتے ہم نے خود ہی کہا "بھارت کے شہر کلکتہ سے جو غالب کے نئے خطوط ملے ہیں وہ آپ نے دیکھے ہیں"۔ نقاد صاحب فرماتے ہیں "نہیں میں نے تو ان خطوط کے متعلق سنا ہے نہ پڑھا ہے"۔ ہم قہقہہ لگاتے ہوئے کہتے ہیں "جناب آج کل بھارت میں تو ان خطوط کا بڑا چرچا ہے۔ ان خطوط سے غالب کی

زندگی کے بعض چھپے ہوئے گوشے پہلی مرتبہ ادبی حلقوں کے سامنے آئے ہیں۔" ہمارے دوست کہتے ہیں " دراصل میں کچھ عرصہ سے ادبی دنیا سے آؤٹ آف ٹچ ہوں۔ گھریلو کام کاج ہی نہیں چھوڑتے۔ اب بھی بچے کے لئے دوائی لینے جارہا تھا کہ آپ مل گئے۔ اچھا اجازت دیجئے۔ پھر ملیں گے۔" ہم دل میں کہتے ہیں قبلہ اب تو آپ اپنے لئے بھی دوا لیں گے۔ اسی شام اپنے حلقہ ارباب ذوق والے دوست سے بھی ملاقات ہوگئی۔ ملتے ہی ہم نے کہا "یار ہم تو ناول کی طرح افسانے کے مستقبل سے بھی مایوس ہوتے جارہے ہیں ہم سمجھتے ہیں تقریبًا ہر زبان میں افسانے کی چولیں ڈھیلی ہوتی جارہی ہیں۔ روس میں بھی افسانے کی سانسیں اکھڑتی جارہی ہیں البتہ افریقہ کے بعض ممالک میں جو حال ہی میں آزاد ہوئے ہیں افسانہ ابھی شکست و ریخت سے محفوظ ہے۔" ہمارے دوست نے پہلے تو ہماری رائے کو حسب معمول ہلکے پھلکے انداز میں لیا اور کہا " نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔ اب مثلاً سہ ماہی "سورج" کے حالیہ شمارے میں سلیم دِل لگی کا افسانہ "ایک گھوڑا۔ دو کاریں" ہی لے لیجئے۔ کتنا اچھا اور اوریجنل افسانہ ہے۔" ہم نے اپنے صحافی دوست کی ہدایت کے مطابق ایک بلند قہقہہ لگایا اور کہا "عزیز من۔ یہ افسانہ تو مشہور امریکی شارٹ سٹوری رائٹر آئی اے ملٹن کے افسانہ "ٹریفک کا شور" کا چربہ ہے اور آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ اس افسانے میں خود ملٹن بھی روسی افسانہ نگار کا ونچ سے متاثر نظر آتا ہے۔" ہمارے دوست اپنی کلائی پر بندھی گھڑی دیکھ کر کہتے ہیں۔ اوہو۔ دس بج گئے۔ مجھے تو ابھی صبح کے ناشتے کے لئے انڈے ڈبل روٹی بھی خریدنی ہے۔ کہیں بیکری بند ہی نہ ہو جائے۔ اچھا کل ملیں گے۔

چند دن ہوئے ہمارے یہ سب دوست ایک چائے خانے میں بیٹھے تھے کہ ہم پہنچ گئے۔ سب احترامًا خاموش ہو گئے۔ ہم نے جاتے ہی بڑے پرجوش انداز میں میز پہ ایک بہت پرانا سا انسانی دانت رکھ دیا اور کہا آپ لوگ حیران ہوں گے کہ ہمیں یہ

پندرہ لاکھ بائیس ہزار چھ سو سالہ پرانا دانت کہاں سے مل گیا۔ ایک دوست بولے وہ تو بعد کی بات ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آپ نے دانت کی عمر کیسے متعین کرلی۔ باقی حضرات بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ ہم نے کہا کہ یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اگر آپ حضرات نے دنیا کے ممتاز ترین ماہر کھدائی مسٹر گولڈ برگ کی شہرہ آفاق کتاب "ہڈیاں اور تہذیبیں" پڑھی ہوتی تو آپ یہ سوال نہ کرتے کہ ہم نے دانت کی عمر کیسے متعین کرلی۔ دراصل کسی بھی قدیم ہڈی سے اس کی عمر، صاحب ہڈی کے کردار، اس کے آباؤاجداد کے چال چلن بلکہ اس معاشرہ کے متعلق بھی جہاں موصوف سانسیں لیتے رہے ہیں روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔" ہمارے نقاد دوست نے ہوٹل کے بیرے کو آواز دی "ملک صاحب کے لئے چائے کے علاوہ پیسٹری بھی لاؤ۔" ہم نے دل میں کہا "ہور چوپو"۔

کل ہماری اس جہاندیدہ دوست سے ملاقات ہو گئی جنہوں نے بقول ان کے "محفل پر چھا جانے کا سنہری نسخہ" ہمیں بتایا تھا علیک سلیک کے بعد ہم نے کہا "آپ نے مصری سفیر کی کتاب "اب کیا ہوگا؟" دیکھی ہے۔ ہمارے دوست پہلے تو کچھ چکرائے اور کہنے ہی والے تھے کہ میں یہ کتاب نہیں پڑھ سکا دراصل پچھلے دنوں بڑا مصروف رہا ہوں لیکن پھر جیسے انہیں کچھ یاد آگیا۔ بزرگانہ مسکراہٹ اور بڑی معنی خیز نظروں سے ہماری طرف دیکھ کر کہا "اچھا آپ بھی دانشور بن گئے اور اب ہمیں ہی ...... بنایا جارہا ہے۔"

آپریشن ماسکیٹو

اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے سبب پیدا نہیں کی۔ اب اپنی عوامی مکھی ہی کو لیجئے۔ بظاہر اس کا کوئی مصرف نظر نہیں آتا، لیکن نہیں ایسی بات نہیں۔ مکھی مختلف امراض کے جراثیم ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے اور وبائی امراض پھیلانے کے کام آتی ہے۔ ہم چونکہ فارغ اوقات میں مکھیوں کی نقل و حرکت کا جائزہ لیتے رہتے ہیں، اس لئے مکھیوں میں یہ دلچسپی بڑھتے بڑھتے اب باقاعدہ ان کے حالات زندگی کے گہرے مطالعہ تک جا پہنچی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ مکھیوں کی بے شمار اقسام ہیں۔ ماہرینِ حیاتیات کے نزدیک اب تک مکھیوں کی چالیس ہزار سے زائد اقسام کا شمار ہو چکا ہے اور ان کے نزدیک معلوم اقسام مکھی کے خانوادے کے عشر عشیر کی بھی نمائندگی نہیں کرتیں۔ مکھیوں کی جسمانی ساخت اور قد و قامت کے مطالعہ سے ہمیں یہ بھی پتہ چلا ہے کہ نر مکھی کا سائز ۸،۵ سے ۶،۵ ملی میٹر تک اور مادہ مکھی کا حجم ۵،۶ سے ۶،۷ ملی میٹر تک ہوتا ہے۔ یعنی بڑی سے بڑی نر مکھی چھوٹی سے چھوٹی مادہ مکھی کے برابر ہوتی ہے۔ یعنی وہی بنی نوع انسان والی بات کہ مردوں کے سائز کم ہوتے جا رہے

ہیں اور مادہ اشرف المخلوق پھلتی پھولتی جا رہی ہے۔ مغربی ماہرین مکھی کی تحقیق کے مطابق ایک مکھی چھ ماہ میں پچیس کھرب، اٹھانوے ارب، بہتّر کروڑ بچہ مکھیوں کو جنم دیتی ہے۔ بیوپار، مکھی بنتے ہی انڈے دینے کا عمل شروع کر دیتا ہے اور ہر تین ہفتہ کے بعد مکھیوں کی نئی نسل منصہ شہود پر آ جاتی ہے۔ ماہرینِ مکھی کی اس مکھیانہ تحقیق کے نتائج کا سیدھا سادا مطلب یہ ہوا کہ ایک عام خوش قسمت پاکستانی (چشم بد دور) اپنی پچاس ساٹھ سال کی عمر میں مکھیوں کی تقریباً چار سو نسلوں سے ڈیل کرتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ایک عام انسان کی زندگی میں مکھیوں کی تقریباً چار سو نسلیں اس کو ہینڈل کرتی ہیں۔

ہماری ذاتی معلومات کے مطابق پاکستان دنیا کے ان دو چار خوش قسمت ممالک میں سے ہے جہاں مکھیوں کی اب تک معلوم ہونے والی چالیس کی چالیس ہزار اقسام پائی جاتی ہیں، بلکہ سنا ہے کہ یہاں کی ہر مکھی اپنے چال چلن اور کردار کے لحاظ سے ایک الگ قسم ہے۔ پاکستان اور ان دو چار خوش قسمت ممالک کے علاوہ دنیا کا کوئی اور ایسا ملک نہیں جہاں مکھیوں کی یہ سب اقسام پائی جاتی ہوں۔ بعض ممالک میں تو نیلے پروں والیاں صرف ایک دو طرح کی مکھیاں پائی جاتی ہیں لیکن بعض ایسے بد قسمت ممالک ہیں جو سرے سے مکھی جیسی دولت ہی سے محروم ہیں۔ اگر آپ چشم تصوّر سے دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ان ملکوں میں زندگی کتنی پھیکی پھیکی اور بے کیف ہو گی۔ ہمارا دوست اور ہمسایہ ملک چین بھی اس نعمت سے محروم ہے۔ سنا ہے کہ انقلاب کے بعد جب تمام انقلاب دشمنوں کا صفایا کر دیا گیا اور چینیوں کے پاس کچھ اور کرنے کو نہ رہا تو انہوں نے صفایا کرنے کی اپنی عادت سے مجبور ہو کر پورے ملک سے مکھیوں کا صفایا کر دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون
البتہ چند مردہ مکھیوں کو حنوط کر کے انہوں نے قومی عجائب گھر میں رکھ چھوڑا ہے تاکہ دوسرے ملکوں کی مکھیاں عبرت پکڑیں۔ لیکن اب صورت حال کچھ بدلتی جا رہی ہے اور پاکستانی حضرات چین جاتے ہیں تو حق دوستی ادا کرتے ہوئے دو چار مکھیاں فی کس

ساتھ لے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مارچ ۱۹۶۴ء میں پہلی بار پی آئی اے سے سفر کرتے ہوئے جب پہلی پاکستانی مکھی پیکنگ پہنچی تو راستے میں پی آئی اے کا مرغ بریانی کا ہیوی لنچ لینے کی وجہ سے اس پر غنودگی سی طاری ہو چکی تھی اور وہ ہوائی اڈے پر اتر کر یوں چلنے لگی جس طرح چاند گاڑی سے اترنے کے بعد نیل آرمسٹرانگ چاند کی سطح پر اڑا اڑ کر چل رہا تھا۔ اس پہلی پاکستانی مکھی کی چین میں اچانک آمد کی خبر پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور ہزاروں لوگ ایک زندہ چلتی پھرتی مکھی کو بچشم خود دیکھنے کے لئے ایئر پورٹ پہنچ گئے۔ بچوں کا جوش و خروش خاص طور پر دیکھنے کے لائق تھا۔ اخبارات کے فوٹو گرافر اور ٹیلی وژن کے کیمرہ مین معزز مکھی کے اردگرد جمع ہو گئے اور مختلف زاویوں سے مہمان گرامی کے کلوز اپ لئے گئے۔ کہتے ہیں کہ مکھی نے ایک کیمرہ مین کو آنکھ بھی ماری کہ موقعہ ہے بنالو دو چار ہزار فٹ فلم۔ کیا یاد کرو گے۔ حکومت کے محکمہ اطلاعات کے فوٹو گرافر نے محترمہ کا ایک خوبصورت پورٹریٹ بنایا۔ کلر شاٹ بھی لئے گئے۔ اچانک فضا میں لڑاکا میراج طیاروں سے ملتے جلتے چار طیارے نظر آئے۔ لوگوں نے سمجھا کہ یہ چینی فضائیہ کے وہ طیارے ہوں گے جنہوں نے پی آئی اے کے اس پہلے جہاز کو چینی فضا میں داخل ہوتے ہی اپنے جلو میں لے لیا ہو گا اور اب یہ طیارے نیچی پرواز کرتے ہوئے معزز مہمان کو سلامی دیں گے۔ لیکن نہیں وہ تو محکمہ صحت کے خصوصی طیارے تھے جو بھاری مقدار میں جراثیم کش ادویات چھڑک رہے تھے۔ نہ جانے کیوں؟ لیکن پاکستانی مکھی اتفاق سے ہلاک ہو گئی۔ دوسرے دن چین کے تمام اخبارات میں صفحہ اوّل پر مرحومہ کی بڑی بڑی تصویریں سیاہ حاشیہ کے ساتھ شائع ہوئیں۔ بتانے والے بتاتے ہیں اس دن سے لے کر آج تک یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ جونہی پی آئی اے کا کوئی جہاز چین کے کسی بھی ہوائی اڈے پر اترتا ہے تو اچانک چین کے محکمہ صحت کے یہ خصوصی طیارے فضا میں نمودار ہوتے ہیں اور جراثیم کش ادویات کا زبردست

چھڑ کاؤ کرتے ہیں ۔ عادت جو ہوئی ۔

ہاں تو ہم عرض کر رہے تھے کہ پاکستان ان دو چار خوش قسمت ملکوں میں سے ایک ہے جو مکھیوں کی دولتِ نایاب سے مالا مال ہیں ۔ بلکہ بعض اوقات تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس جس نسل اور ذات کی مکھی یہاں پائی جاتی ہے شاید ہی کسی اور ملک میں پائی جاتی ہو ۔ یہاں اعلیٰ سے اعلیٰ اور خاندانی سے خاندانی مکھی پائی جاتی ہے ۔ خاص طور پر پنجابی مکھیوں کا مکھی پن لاثانی ہے ۔ پنجابی مکھی ہر بڑے اور خاص طور پر دوسرے صوبوں کے بڑوں کی ناک پر بیٹھنے کی کوشش کرے گی اور اس پر فخر محسوس کرے گی لیکن پہچاننے والے پہچان جاتے ہیں کہ مکھی بالآخر مکھی ہی ہوتی ہے ۔ اس لئے وہ ان کے بھنکنے کو تو گوارا کر لیتے ہیں لیکن ان کی بھنبھناہٹ سن کر ان مکھیوں کو مکھی کی طرح نکال باہر کرتے ہیں ۔ اور پنجابی مکھی پھر بھی مکھی پر مکھی ماری جاتی ہے ۔ یعنی بے سمجھ مکھیوں کی پہلی نسلوں کی نقل کرتی چلی جا رہی ہے ۔ نہ جانے اس کا یہ مکھی پن کب ختم ہوگا ؟ بلوچی مکھی ناک پر بیٹھنے کی بجائے ناک میں گھسنے کی کوشش کرتی ہے ۔ اب لاکھ سمجھاؤ کہ بی بی ناک تو ہوا وغیرہ کی گذرگاہ ہے کوئی شاہراہِ مکھی تو نہیں کہ یوں چلی آرہی ہو ۔ لیکن وہ کہے گی کہ اگر ہمیں ناک پر نہ بیٹھنے دوگے تو پھر ہم ناک ہی میں گھسیں گی ۔ ٹھیک ہے بی بی ۔ سندھ کی مکھی اپنے علاوہ کسی اور کو مکھی نہیں سمجھتی ۔ بلکہ دوسری مکھیوں کو کہے گی ، ہُوں ۔ یہ کیا ہیں بس مکھیاں سی تو ہیں ۔ سندھ کی بعض مکھیاں اپنے سندھی مکھی ہونے پر اس حد تک فخر محسوس کریں گی کہ دوسری مکھیوں کو مکھی برابر نہیں سمجھتیں بلکہ مچھر سمجھتی ہیں ۔ جبکہ صوبہ سرحد کی مکھی کی بھن بھن یعنی بھنبھناہٹ بظاہر بہت ہی بھن بھن معلوم ہوگی اور معلوم ہوگا کہ یہ بھنبھناہٹ اُدھر سے اِدھر آرہی ہے لیکن ہم جیسے مکھی شناس جانتے ہیں کہ بھنبھناہٹ دراصل مقامی ہی ہے ۔ لیکن نسواری فضا یعنی نسوار کی تیزابی ہواؤں میں سانس لینے کی وجہ سے اس کی بھنبھناہٹ میں ذرا تیزی اور کھردرا پن آ

جاتا ہے۔ پاکستانی مکھیوں کے متعلق ہم ابھی بہت کچھ کہہ سکتے ہیں۔ لیکن فی الحال ہم اس موضوع پر زیادہ روشنی ڈالنے کے موڈ میں نہیں ہیں اور اب کچھ مچھروں کے بارے میں کہیں گے۔

ہم جس قدر مچھروں سے الرجک ہیں مکھیوں سے نہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ مچھر رات کو ہم سے اٹھکیلیاں کرتے ہیں، بلکہ اس کی وجہ ان کی بڑھتی ہوئی وہ دیدہ دلیری ہے جس کا ذکر ہم ذرا آگے چل کر کریں گے۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ ہر حکومت مچھروں ہی کے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہے اور حکومت نے خصوصی طور پر مچھروں کو تلف کرنے کے لئے کئی ایک محکمے کیوں قائم کر رکھے ہیں جبکہ اپنی مکھیاں بھی ملک گیر اثرات، وسیع تر اثر ورسوخ اور دُور دُور تک پہنچنے میں مچھروں سے کسی بھی لحاظ سے کم نہیں لیکن انسداد مکھیاں کا کوئی محکمہ ہی نہیں۔ یعنی دائرہ کار تو وسیع ہے اپنی مکھیوں کا لیکن انسداد ہو رہا ہے مچھروں کا۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ مرحوم صدر محمد ایوب خان کو بھی مچھروں سے بہت چڑ تھی۔ اور اس زمانے میں حکومت کے محکمہ مچھر مار نے امریکی ڈی ڈی ٹی گاؤں گاؤں اور شہر شہر چھڑک بھی دی تھی۔ لیکن یوں معلوم ہوتا تھا کہ ڈی ڈی ٹی انسداد مچھراں کی بجائے فروغِ تخمِ مچھراں کے لئے چھڑکی گئی تھی چنانچہ اطلاعات ملیں کہ مچھروں میں اضافہ ہوگیا ہے۔ ہمارے ایک عزیز بھی اس محکمہ میں مچھروں کے قتل عام کے کام کے نگران تھے اور ان کے ہاتھ ہزاروں لاکھوں مچھروں کے خون سے ہر وقت رنگے رہتے تھے۔ جب کبھی ملتے تو السلام علیکم کہہ کر ہاتھ آگے بڑھاتے لیکن ہم صرف مسکرا کر سر کو ہلکی سی جنبش دے دیتے اور وعلیکم السلام کہہ دیتے۔ ایک دن ہم نے ان سے پوچھا۔ قدیر صاحب۔ یہ آپ دو تین سال سے مچھر پہ مچھر مارتے چلے آرہے ہیں لیکن ہماری مصدقہ اطلاعات کے مطابق مچھروں کی برادری مزید پھیلتی جا رہی ہے۔ بلکہ اب تو صورت حال یہ ہے کہ دُور سے بادلوں کے کسی آوارہ ٹکڑے

کا جو سایہ سا نظر آتا ہے۔ قریب آنے پر معلوم ہوتا ہے کہ مچھروں کی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی ٹکریاں ہیں اور بعض اوقات سر اوپر اٹھا کر دیکھیں تو پچاس ساٹھ خوش مزاج مچھروں کا کوئی گروہ آپ کے سر پر اس طرح ایک خاص دائرے میں گردش کرتا نظر آئے گا جس طرح موٹر سائیکل سوار موت کے کنوئیں میں موٹر سائیکل نیچے اوپر اور آڑے ترچھے دائروں میں گھماتا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اگر آپ اٹھ کر چلنا شروع کر دیں تو پھر بھی آپ کے سپیڈو میٹر کی سوئی دیکھ کر اسی رفتار سے آپ کے سر پر منڈلاتے، جھولتے اور قلابازیاں کھاتے نظر آئیں گے۔ ہم نے کہا قدیر صاحب۔ آخر یہ کیا معاملہ ہے؟ قدیر صاحب نے ایک بھرپور اور طویل قہقہہ لگایا جیسے انہیں ہماری کم علمی بلکہ لاعلمی پر ہنسی آ رہی تھی۔ قہقہہ تھما تو انہوں نے رومال سے اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے فخریہ کہا کہ بادشاہو۔ یہ مچھر جو آپ کو نظر آتے ہیں یہ ملیریل ماسکیٹو (ملیریا پھیلانے والے مچھر) تو نہیں۔ ملیریل ماسکیٹو تو ہم نے ختم کر دیئے ہیں۔ یہ تو بس ایسے ہی ہیں۔ ہم نے کہا "بس ایسے ہی ہیں" سے کیا مطلب؟ کہنے لگے یہ ویسے مچھر تو ہیں لیکن دراصل مچھر نہیں ہیں بس ایسے ہی ہیں۔ ہم نے قدرے حیران ہو کر کہا۔ قدیر صاحب۔ آپ درست فرماتے ہوں گے لیکن سوال تو یہ ہے کہ یہ مچھر جو بس ایسے ہی ہیں رات کو شرفا سے چھیڑ چھاڑ کے اپنے پرانے مشاغل تو ویسے کے ویسے ہی جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ مچھر ہی ہوئے نا بس ایسے ہی تو نہ ہوئے۔ موصوف کہنے لگے۔ وہ درست ہے لیکن ہمارا دعویٰ ہے کہ حکومت نے انسداد ملیریا کے لئے جو ملیریل ماسکیٹو تلف کرنے کا کام ہمارے ذمہ سونپا تھا وہ ماسکیٹو ہم نے ختم کر دیئے ہیں بلکہ آپ کو ملیریل ماسکیٹو کا ایک دانہ بھی نہیں ملے گا اور یہ جو عام مچھروں کی آپ بات کر رہے ہیں ان کے متعلق ان پڑھ عوام میں غلط فہمی پائی جاتی ہے۔ بہرحال ہمارا یہی کہنا ہے کہ یہ مچھر دراصل مچھر نہیں بس ایسے ہی ہیں۔ ہمارے ایک سمجھدار دوست نے کہا کہ آپ سرکاری محکموں کے اعداد و شمار کے

گورکھ دھندوں اور ان کے چارٹوں اور نقشوں کی بھول بھلیوں پر نہ جائیں۔ لیکن اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ڈی ڈی ٹی کے چھڑکاؤ کے باوجود مچھر ابھی تک اپنے مورچوں میں کیوں ڈٹے ہوئے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے سخت جان دیسی مچھروں کا یہ نرم نرم امریکی ڈی ڈی ٹی کچھ نہیں بگاڑ سکتی، بلکہ اب ہمارے مچھر ڈی ڈی ٹی پروف ہو گئے ہیں اور بعض مچھر تو ڈی ڈی ٹی کو ملٹی ڈامنز سمجھ کر صبح و شام کھانے کے بعد استعمال کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا البتہ میرے ذہن میں مچھر مارنے کا ایک تیر بہدف نسخہ آرہا ہے وہ یہ کہ ایک صاحب دونوں ہاتھوں سے مچھر پکڑیں، دوسرے صاحب دونوں ہاتھوں سے اس کے جبڑے کھولیں اور تیسرے صاحب فوراً ڈی ڈی ٹی کی پوری بوتل بھر کر حلق میں انڈیل دیں تو ممکن ہے مچھر وقتی طور پر بے ہوش ہو جائے اور اس کی اس بے ہوشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چوتھے صاحب اسے ہلاک کر سکتے ہیں۔ اور یہی ترکیب ہر مچھر پر آزمائی جا سکتی ہے۔

ہم اس بحث کو چھوڑ کر کہ ہمارے یہ ہم عصر مچھر بس ایسے ہی ہیں یا حقیقت میں مچھر ہی ہیں اب ہم اس دیدہ دلیری کا ذکر کریں گے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم مچھروں کی اس دیدہ دلیری کی وجہ سے ان کے خلاف ہیں۔ ماہرین مچھراں نے حال ہی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اگر کسی کمرے میں ایک مرد اور ایک خاتون بیٹھے ہوں تو مچھر پہلے خاتون کو کاٹے گا اور زنانہ خون پینے کے بعد اگر مردانہ خون بھی بطور سویٹ ڈش پینے کی ضرورت محسوس کرے تو مرد پر بھی جا بیٹھے گا ورنہ خاتون ہی سے بغل گیر ہو کر اڑ جائے گا۔ یہ بھی سنا ہے کہ کہ بعض شرارتی قسم کے مچھر رات کو بے خیالی میں سوئی ہوئی خواتین کی طرف راغب ہوتے ہیں اور بے خبر خواتین کی اونچائیوں پر اور وادیوں میں یوں لینڈ کرتے ہیں جیسے یہ جگہیں ننانوے سال کی لیز پر لے رکھی ہوں۔ بعض نڈر اور دلیر مچھر باقاعدہ چہل قدمی بھی شروع کر دیتے ہیں جبکہ بعض مہم جو کوہ پیمائی کے

شوق میں نکل کھڑے ہوتے ہیں ۔ ع

جب پیار کیا تو ڈرنا کیا

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معزز خواتین سے یوں چھیڑ چھاڑ کرنے والے اور ان کی بے خبری سے یوں ناجائز فائدہ اٹھانے والے مچھر زنانہ مچھر یعنی مچھرنیاں ہوتی ہیں یا آوارہ راہ راست سے بھٹکے ہوئے مردانہ مچھر ہوتے ہیں ۔ ہم سمجھتے ہیں یہ کام ماہرین مچھراں کا ہے کہ وہ اس ساری تشویشناک صورت حال کو اس زاویہ سے بھی دیکھیں اور عوام کو اعتماد میں لے کر بتائیں کہ آخر ان دست درازیوں کا مطلب کیا ہے ؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ خواتین پر یوں حملہ آور ہونے والا مچھر مرد مچھر ہوتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے میں خاتون مچھر کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں ؟ بہر صورت اگر ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہو کہ خواتین سے بوس و کنار کرنے والے مچھر مرد مچھر ہوتے ہیں تو پھر ہم حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ اس مملکت خداداد پاکستان میں عریانی (خواتین کی) اور فحاشی (مچھروں کی) کو روکا جائے اور جو حکومت عورت کی چادر کو مچھروں سے محفوظ نہیں کر سکتی وہ ان نکمچھوں سے عورت کو کیسے بچا سکتی ہے جو چار دیواری توڑ کر فائرنگ کرتے ہوئے رات کے اندھیرے میں کمروں میں داخل ہو جاتے ہیں ۔

ہم نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بے سبب پیدا نہیں کی ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مچھروں کے جائز ، سود مند اور مثبت مصرف کے بارے میں سوچا ہی نہیں گیا ۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ دنیا کی ہر بری سے بری شے اور بظاہر خطرناک سے خطرناک چیز کو بھی بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے کام لایا جا سکتا ہے ۔ مچھر بھی معاشرے کے لئے اہم خدمات سرانجام دے سکتے ہیں ۔ ہم یہاں اپنی طرف سے اس ضمن میں ایک دو مثبت تجاویز پیش کر رہے ہیں ۔ دوسرے اہلِ فکر اور صاحبِ دماغ حضرات بھی مچھروں کے جائز استعمال کے متعلق کوئی ٹھوس رائے رکھتے ہوں تو ہمیں مطلع فرمائیں ۔

ایک دفعہ ہمیں آرمی کا ڈاگ سینٹر دیکھنے کا موقع ملا۔ ہم نے دیکھا کہ فوجی حضرات کتے جیسی کتی شے کو سدھار رہے ہیں اور کتے ان کے اشارے پر زمین سونگھتے سونگھتے اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ دراصل جس کے ہاتھ میں ڈنڈا ہو اس کے آگے پیچھے بہت سے کتے دم ہلاتے چلے آتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ کتے جب اپنا کورس مکمل کر لیں گے تو چوری ڈاکے اور سمگلنگ جیسی وارداتوں کا سراغ لگانے میں تفتیشی حکام کی مدد کیا کریں گے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ بالکل اسی لائن پر ایک نیشنل ماسکیٹو سنٹر قائم کیا جائے اور یہ کام بھی فوج کے سپرد کیا جائے۔ جس طرح شہد کی مکھیوں سے شہد حاصل کرنے کے لئے انہیں سفید رنگ کے مختلف ڈبوں میں بند رکھا جاتا ہے اسی طرح مچھروں کو مختلف ڈبوں اور خانوں میں پالا جائے اور ڈبوں یا خانوں کی تقسیم خون کی مختلف پائی جانے والی قسموں اور گروپوں کے مطابق کی جائے۔ مثلاً اے، بی، او، + او، - او وغیرہ وغیرہ۔ اور گروپوں کے یہ نمبر خانوں کے اوپر بڑے بڑے حروف میں لکھ دیئے جائیں۔ اب مچھروں کو پہلے یہ تربیت دی جائے کہ وہ ڈبوں سے اڑ کر سینٹر کی عمارت کے ہی دو چار چکر لگا کر واپس اپنے اپنے ڈبوں میں آ جایا کریں۔ پھر آہستہ آہستہ ان کی مار کا دائرہ بڑھایا جائے اور یہ دائرہ کار محلوں سے شہروں تک بڑھایا جائے۔ پرانے زمانے میں جس طرح کبوتر پیغام رسانی کا کام دیتے تھے اسی طرح ان مچھروں سے خون جمع کرنے کا تعمیری کام لیا جائے۔ اس سلسلہ میں یہ احتیاط ضروری ہے کہ نیشنل ماسکیٹو سینٹر کی انتظامیہ کو محکمہ موسمیات سے گہرا رابطہ رکھنا ہوگا کہ جس دن تیز آندھی و طوفان وغیرہ کا خطرہ ہو اس دن ان مچھر درکروں کو مہم پر نہ بھیجا جائے یا انہیں یہ سمجھا دیا جائے کہ موسم کی اچانک خرابی کے دوران دشمن کے علاقہ میں جہاں مناسب سمجھیں پناہ لے لیا کریں اور لائن کلیئر ملنے کے بعد واپس اپنے اڈوں پہ پہنچ جایا کریں۔ تربیت میں ایک احتیاط یہ بھی ضروری ہے کہ مچھر صرف بڑے بڑے صحت مند گھبرو مچھوں کا ہی خون چوسیں۔ یعنی پہلے ہزار ہزار دو دو ہزار گز یعنی

دو چار کنالوں پر پھیلے ہوئے کسی عالیشان بنگلے کے اوپر راؤنڈ لگائیں اور صورت حال کا جائزہ لیں پھر ڈائی لگا کر ٹارگٹ پر جا بیٹھیں۔ اور لے کر نام اللہ کا کر دیں اپنی سوئی اندر۔ پنے اپنے مشکیزے بھرنے کے بعد نیچی پرواز کرتے ہوئے سیدھا اپنے اڈوں پر واپس آ جائیں، جہاں سفید دستانے پہنے ان کے منتظر فوجی بوتلوں میں خون نچوڑتے جائیں گے۔ اس طرح قومی بلڈ بنک میں ایک ہی رات میں سینکڑوں بوتلیں تازہ اور صحت مند خون جمع ہو سکتا ہے جو سی ایم ایچ کے علاوہ سول ہسپتالوں کو بھی سپلائی کیا جا سکتا ہے تاکہ مریضوں کو بھنگیوں چرسیوں سے حاصل کئے گئے خون کے بجائے صحت مند خون دیا جائے۔ ہم تو یہ بھی کہتے ہیں کہ خون زیادہ جمع ہو جانے کی صورت میں غریبوں میں مفت بھی تقسیم کیا جا سکتا ہے اور ہر غریب آدمی بس شوقیہ ہی ایک دو بوتلیں تازہ خون چڑھا لے تاکہ اگر ان کے جگروں اور معدوں نے خون بنانا چھوڑ دیا ہے تو یہ خون بھی تو انہی کا ہے۔ عام طور پر تو او گروپ والے کو او گروپ کا ہی خون دیا جائے گا اور او گروپ والے سدھائے ہوئے مچھر صرف او گروپ کا خون ہی کشید کریں گے۔ لیکن ہمارا مشورہ ہے کہ سیاستدانوں وغیرہ سے ڈیل کرنے کے لئے ان کو کوڑے وغیرہ مارنے کے بجائے یہ بہتر ہو گا کہ انہیں علالت کے دوران (کہ وہ علیل ہوتے ہی رہتے ہیں) ایسا خون دیا جائے جس سے وہ مزید کنفیوزڈ ہو جائیں اور ان کے ہر اخباری بیان پر پبلک لوٹ پوٹ ہوتی رہے۔ ہم اس اپریشن کو "اپریشن ماسکیٹو" کا نام دیں گے۔ گوریلے قسم کے مچھروں کا ایک ایسا دستہ تیار کیا جائے جو مخصوص گروپ کا خون کشید کرنے کے بجائے ہر طرح کے لوگوں، چھوٹوں، بڑوں، عورتوں، مردوں، بیماروں، صحت مندوں، پاگلوں، مسخروں وغیرہ وغیرہ کا خون کشید کریں۔ خاص مچھروں کا یہ سکواڈ خود اتنا سخت جان ہو کہ ہر طرح کا خون کھینچ سکے، لیکن اس کی اپنی باڈی پر کوئی برا اثر نہ پڑے۔ مچھروں سے یہ سپیشل خطرناک خون نچوڑنے والا فوجی سفید کی بجائے سرخ دستانے پہنے ہوئے ہو اور

ناک مُنہ پر ماسک بھی چڑھایا ہوا ہو۔ کمرے کے باہر ایک سرخ رنگ کا بلب روشن ہو اور ایمبولینس کے مخصوص سائرن کی طرح آوازیں نکل رہی ہوں۔ ٹیں۔ ٹیں۔ ٹیں ٹیں ٹیں..... جب کوئی شرپسند سیاستدان قابو آجائے اور اس کے بارے میں طے ہو جائے کہ وہ "ملکی مفاد" کے خلاف کام کر رہا ہے تو بسم اللہ پڑھ کر اُس کو اس سپیشل خون کی ایک بوتل چڑھا دی جائے اور پھر اسے عوام میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔ دن رات پھر کی طرح گھوں گھوں کرتا پھرے گا۔ اور محلوں گلیوں کے چھوٹے چھوٹے بچے پتھر اٹھائے اس کے پیچھے پیچھے بھاگتے پھریں گے۔ پاگل ای اوے۔ پاگل ای اوے ..... ہم قومی مفاد میں اس طرح کے اور بہت سے مفید مشورے دے سکتے تھے، مگر افسوس کہ اس ملک میں ٹیلنٹ کی قدر ہی نہیں۔

کُل پاکستان ہجرطہ کانفرنس

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم ایک روزانہ اخبار کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر ہوا کرتے تھے۔ ہمارے پاس روزانہ شام کو ٹیلیفون کالوں کے علاوہ کئی ایک افراد اور وفود آدھمکتے اور شکایت کرتے کہ آپ کے اخبار نے ہماری فلاں خبر شائع نہیں کی حالانکہ فلاں مقامی اخبار نے اسی خبر کو نمایاں طور پر شائع کیا ہے۔ شکایت کنندگان قوم کی خاطر دی گئیں اپنی بے لوث قربانیوں کا ذکر کرتے اور کہتے کہ ہم تو اس اخبار کو اپنا اخبار سمجھتے ہیں لیکن آپ لوگ ہماری حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ ان وفود میں علماء کرام کے وفود، طلباء کے وفود تاجروں کے وفود اور دوسرے تقریباً ہر طبقے، شعبے اور پیشے کے وفود شامل ہوتے۔ کبھی کبھار کوئی خاتون رہنما بھی اپنے چند ورکروں کے ساتھ آجاتیں اور کہتیں، دیکھئے ہم اتنے عرصہ سے فیلڈ میں ہیں اور قوم کی خاطر دن رات ہر طرح کی قربانی دے رہی ہیں۔ ہم نے قوم کی خاطر اپنے شوہروں اور بچوں تک کو نظر انداز کر دیا ہے اب بھی شوہر کو گھر بٹھا کر آئی ہیں لیکن افسوس کہ آپ نے پھر بھی ہماری فلاں پریس کانفرنس

کی تصویر شائع نہیں کی۔ ایسے موقعوں پر ہم عام طور پر ایسے وفود کو اپنی مجبوریاں سمجھاتے کہ اخبار میں جگہ کی کمی ہوتی ہے لیکن ساتھ یہ وعدہ بھی کر لیتے، آئندہ کوشش کریں گے کہ آپ کو شکایت کا موقع نہ ملے۔ لیکن ایک دن ہمارے پاس تین ایسے شکایت کنندگان آ گئے جو نہ مرد تھے نہ عورت!! دو نے موسم گرما کی مناسبت سے بڑے سلیقے سے پرنٹڈ لان کی شلوار قمیض پہن رکھی تھیں اور شانوں پر شان بے نیازی سے پٹی نما دوپٹے ڈال رکھے تھے۔ کٹے ہوئے بال اور ہونٹوں پر لپ سٹک۔ ان دونوں میں ان ظاہری زنانہ خصوصیات کے علاوہ کچھ اور نیم زنانہ نشانیوں کا بھی گمان ہو رہا تھا یا ممکن ہے محض زنانہ کپڑوں کی موجودگی میں دل نے بہت کچھ سمجھ لیا ہو لیکن اصل میں یہ سب کچھ نہ ہو تیسرے شکایت کنندہ میں بظاہر مردانہ کیفیات نمایاں تھیں۔ ان کے چہرے سے واضح طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ موصوف روزانہ شیو کرتے ہیں بلکہ ممکن ہے کہ الٹے استرے سے شیو کرتے ہوں۔ اس لئے کہ داڑھی کے بال جڑوں سے غائب تھے۔ قمیض کے اوپر کے کھلے بٹنوں سے سینے پر پوڈر کا بے دھڑک چھڑکاؤ نظر آ رہا تھا۔ انہوں نے ہمارے قریب آ کر اپنے دونوں ہاتھوں سے مچھر مارنے کے انداز میں تالی بجائی اور کہا ”اللہ رکھے۔ آپ ہیں ایڈیٹر صاحب“

”جی۔ اتفاق سے ہم ہی ایڈیٹر ہیں۔ فرمائیے ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں“ ہم نے کہا۔

موصوف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”مجھے خورشید کہتے ہیں۔ صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی۔ اور یہ ہماری سیکرٹری تسنیم کوثر ہیں اور وہ بیٹھی ہیں ہماری پبلسٹی کی انچارَج (صدر صاحب نے لفظ انچارج کے حرف ر پر زبر کا اضافہ کر دیا) مس عندلیب۔ تسنیم کوثر نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی یعنی بندہ/بندی حاضر ہے جبکہ مس عندلیب نے بڑی دلربائی کے ساتھ اپنے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں اپنے

ماتھے پر رکھتے ہوئے آداب عرض کہا۔ ہم نے بھی جواباً آداب عرض کہا اور صدر صاحب سے کہا تشریف رکھئے۔ صدر صاحب نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا "جی ہمارے ساتھ بہت زیادتی ہو رہی ہے۔ ہم بھی اللہ کی مخلوق ہیں، لیکن سمجھ نہیں آتی کہ یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے"؟

ہم :۔ "گورنمنٹ کا کوئی خاص افسر آپ کے ساتھ کچھ کرنا چاہتا ہے یا پوری گورنمنٹ ہی بیک وقت آپ میں دلچسپی لے رہی ہے"؟

صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی :۔ "نہیں ایڈیٹر صاحب۔ ابھی تک گورنمنٹ نے ہمارے مخصوص مقام ہی کو نہیں پہچانا۔ آخر ہم بھی اس ملک کے شہری ہیں اور آپ کی طرح ہمارا بھی ایک مخصوص مقام ہے۔ گورنمنٹ ہمارے مقام کو کیوں نہیں پہچانتی۔ ہم حیران ہیں کہ آخر یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے"۔

ہم :۔ دیکھئے صدر صاحب۔ آپ بڑی ذو معنی باتیں کر رہے ہیں جبکہ ہم بغیر کسی گنجلک، شک اور ابہام کے بات کرنے اور شائع کرنے کے اصول پر کاربند ہیں۔ لہٰذا آپ ذرا کھول کر بات کریں"۔

صدر صاحب :۔ "ہائے ایڈیٹر صاحب۔ ذو معنی اور بے شرمی باتیں تو آپ کر رہے ہیں۔ ہم کیوں کھول کر بات کریں اور پھر دفتر میں سب کے سامنے"۔

ہم نے فوراً اپنے اوپر سنجیدگی طاری کی اور ذرا خشک لہجہ میں کہا" دیکھیں آپ حضرات ہمارا قیمتی وقت ضائع کر رہے ہیں۔ آخر آپ کی تشریف آوری کا مقصد کیا ہے"۔

صدر صاحب :۔ "نی عندلیب۔ ایڈیٹر صاحب تو ناراض ہو گئے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب۔ ہم تو اس لئے حاضر ہوئے تھے کہ ایک تو آپ ہماری خبریں شائع نہیں کرتے اور دوسرے یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے"۔

ہم :۔ دیکھئے جہاں تک خبر کا تعلق ہے۔ آپ اپنی خبر ہمارے نیوز ڈیسک کو دے دیں

خبر شائع ہو جائے گی اور جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ گورنمنٹ آپ کے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ گورنمنٹ گورنمنٹ ہوتی ہے کس وقت کس کے ساتھ کیا کرنا ہے یہ بات وہ خود بہتر سمجھتی ہے ہم حکومت کے نجی معاملات میں دخل نہیں دیتے۔"

صدر محترم :۔" ایڈیٹر صاحب۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جس حکومت نے ہجڑوں کی قدر نہیں کی زوال پذیر ہوئی۔ ہمیں تو مغلیہ خاندان کے بادشاہوں اور دوسرے راجاؤں مہاراجاؤں کے شاہی محلوں تک رسائی تھی اور بادشاہوں کے اہم معاملات میں ہمارا بھی عمل دخل ہوتا تھا۔ ان کی بیگمات بھی ہم سے چونچلے کرتی تھیں اور ہر امیر اور وزیر ہمارا مخصوص مقام پہچانتا تھا۔ لیکن اب صدر مملکت اور وزیر اعظم تو کیا مقامی ڈپٹی کمشنر سے بھی ہم نہیں مل سکتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ حکومت ہمیں اپنے کاغذات میں مرد لکھتی ہے جبکہ ہم اپنے آپ کو خواتین کہلانا پسند کرتے ہیں۔ ووٹروں کی فہرست میں ہمارا نام عورتوں کے خانے میں لکھا جائے اور ہماری تیسری ڈیمانڈ یہ ہے کہ غیر ملکی وفود میں ہمارے نمایندے بھی شامل کئے جایا کریں ......"

اب صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی کی گفتگو دلچسپ ہوتی جارہی تھی چنانچہ ہم نے بوریت کی بجائے صدر صاحب کے ارشادات کو ہمہ تن گوش ہو کر سننا شروع کر دیا جب صدر صاحب نے اپنی تمام شکایات گنوالیں تو ہم نے حسب معمول ان کو اپنے قیمتی مشورں سے نوازا۔ وقت کی کمی کے باعث ہم زیادہ تفصیل میں نہیں گئے۔ لیکن پھر بھی ہم نے دنیا کے موجودہ حالات اور خاص طور پہ پاکستان کے اندرونی حالات اور اس پہ بیرونی دباؤ جیسے معاملات کے پس منظر میں صدر مسٹر خورشید، تسنیم کوثر اور مس عندلیب کو ایک فائیو پوائنٹ پروگرام دے دیا۔ ان الفاظ کا خلاصہ یہاں درج کیا جاتا ہے تاکہ نہ صرف پاکستان کے دوسرے ہجڑے بلکہ بیرونی ممالک کے ہجڑے بھی مستفید ہو سکیں۔ ہم نے کہا۔

۱۔جہاں تک سربراہ حکومت کے ہاں رسائی حاصل کرنے کا تعلق ہے یا ان کے ہاں باقاعدہ کسی سینئر گریڈ میں ملازمت حاصل کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام موجودہ دور میں تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ ویسے بھی اب ایوان صدر یا دوسرے بڑے بڑے ایوانوں میں ہجڑوں کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب یہی کام دوسرے حضرات بڑی خوش اسلوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ ہم نے کہا دنیا میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ مردوں کے بعض کام اب مشینیں اور کمپیوٹر کر رہے ہیں۔ اس طرح اب بادشاہوں اور صدروں کے معاملات میں ماضی میں ہجڑوں کا جو کردار تھا وہ اب مردوں کے سپرد ہو چکا ہے۔ ویسے بھی ہجڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک جسمانی دوسرے ذہنی۔ اگر ماضی میں شاہی محلات تک جسمانی ہجڑوں کو رسائی حاصل تھی تو اب ذہنی ہجڑوں کا دور ہے۔ جسمانی ہجڑے تو ہجڑے ہو کر بھی ذہنی طور پر مرد ہو سکتے ہیں۔ لیکن آج کل کے ذہنی ہجڑے مرد ہوتے ہوئے بھی جسمانی ہجڑے بن جاتے ہیں۔ اس لئے ذہنی ہجڑوں میں جسمانی ہجڑوں سے زیادہ ہجڑہ پن ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور ذہنی ہجڑوں کا ہے جسمانی ہجڑوں کا نہیں۔ ہم نے بتایا ذہنی ہجڑوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ بڑے آدمی کی ہر ہر بات پر تالیاں بجائیں گے اور "واہ واہ، سبحان اللہ۔ اللہ سلامت رکھے"۔ کہتے نظر آئیں گے۔ جبکہ ان بڑے لوگوں کے قریب مغرب زدہ ذہنی ہجڑے ہر ہر بات پر کہیں گے "سر۔ ونڈر فل۔ اس موو Move یعنی اقدام) سے آپ کا امیج اور بڑھ جائے گا اور تیسری دنیا کے کئی ممالک آپ کے اس پروگرام کی کاپی کریں گے۔۔۔۔" ہم نے مشورہ دیا کہ ان حالات میں آپ اپنی یہ ڈیمانڈ واپس لے لیں۔ البتہ اس انتظار میں رہیں کہ اگر مستقبل میں ہمیں دوبارہ کوئی رنگیلا صدر نصیب ہوا تو اس صورت میں ممکن ہے کہ وہ تفریح طبع کے لئے آپ لوگوں سے بھی براہ راست میل جول بڑھائے۔ اس لئے آپ اچھے دنوں کا انتظار کریں۔

۲۔ ہمارا دوسرا قیمتی مشورہ یہ تھا کہ ووٹروں وغیرہ کی فہرستوں میں آپ اپنے نام فی الحال "انتظار کرو اور دیکھو" کے سنہری اصول پر عمل کرتے ہوئے مردوں کے خانے ہی میں رہنے دیں۔ اس کی وجہ ہم نے یہ بتائی کہ جس رفتار سے آج کی عورت مرد اور آج کا مرد عورت بنتی جارہی ہے اس رفتار سے ممکن ہے آیندہ دو چار سال میں عورتیں ہر لحاظ سے مرد اور مرد مکمل طور پر عورتیں بن جائیں۔ ایسی صورت میں آپ کو پھر یہ ڈیمانڈ کرنا پڑے گی کہ آپ کا نام اِس خانے یا اُس خانے میں لکھا جائے اور لوگوں کو یہ کہنے کا موقع مل جائے گا کہ دیکھو جی۔ ہیجڑے بھی مستقل مزاج نہیں ہیں۔ لہٰذا انسان کو ہمیشہ دور اندیش ہونا چاہیئے اور وقتی اور سطحی منفعت کی بجائے مستقبل میں دیرپا فوائد کو سامنے رکھنا چاہیئے۔ آپ آج کے مرد کا لباس اور چال ڈھال دیکھیں، اس کی گفتگو سنیں اور اس کی دوسری مصروفیات دیکھیں۔ اسی طرح آج کل لڑکیوں کا لباس اور ان کی چال ڈھال دیکھیں۔ کیا دونوں میں کسی بھی لحاظ سے کوئی نمایاں فرق ہے؟ بلکہ اب تو ہم نے سنا ہے کہ مردوں کے بعض دیگر فرائض بھی خواتین نے خود سنبھال لئے ہیں اور مرد محض عورتیں بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے میں آپ حضرات جلد بازی سے کام نہ لیں اور "انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی اپنالیں۔ مردوں اور عورتوں میں اور ان کے فرائض میں ان تبدیلیوں کو کسی منطقی نتیجے پر پہنچ لینے دیں اور اس کے بعد اپنا راستہ متعین کریں۔ صدر ہیجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی نے اپنی سیکرٹری تسنیم کوثر سے کہا۔ "نی۔ ایڈیٹر صاحب کی قیمتی باتاں نوٹ کرو۔ یہ ہر روز تو ہمیں ٹائم نہیں دیں گے۔ کبھی تو اپنی ذمہ داری کا احساس کیا کرو۔ نہ جانے یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے۔"

۳۔ ہم نے کہا جہاں تک آپ کے مخصوص مقام کا تعلق ہے اس کا تعین ضرور ہونا چاہیئے اور حکومت کو آپ کے مخصوص مقام کا علم ہونا چاہیئے۔ لہٰذا آپ حکومت سے مطالبہ کریں کہ وہ فوری طور پر ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن قائم کرے جو گہری

پھان بین اور چاروں صوبوں کے ہجڑوں کے نمائندوں سے ملاقات کریں اور معاشرے میں آپ کے مقام اور کردار پر تبادلہ خیالات کریں۔ کمیشن کے چیئرمین اچھے ہجڑوں کی سٹیٹ منٹ (بیانات) خود لیں تاکہ وہ خود بھی ہجڑوں کی خواہشات اور ان کی مشکلات سے براہ راست آگاہ ہوسکیں۔ کمیشن دوسرے ممالک میں ہجڑوں کی فلاح و بہبود کے لئے قائم کئے گئے اس طرح کے قومی کمیشنوں کی رپورٹیں بھی پڑھے تاکہ رپورٹ لکھتے وقت دوسرے ممالک کے ہجڑوں کے مسائل بھی سامنے رہیں اور اس طرح عوام بھی بہت متاثر ہوتے ہیں کہ کمشن نے بہت کام کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ کمشن جب اپنا کام ختم کرلے اور حکومت کو رپورٹ پیش کردے تو پھر آپ احتیاطاً متعلقہ وزارت کے افسروں سے بھی مل لیں۔ یہ اس لئے ضروری ہے کہ حکومت عام طور پر ایسی رپورٹوں پر بیٹھی رہتی ہے اور کمشن کی سفارشات پر عمل کم ہی ہوتا ہے اور دو چار سال بعد پھر ایک نئے کمشن کی تشکیل کی ضرورت پڑجاتی ہے۔ ہمیں یوں محسوس ہوا کہ مسٹر خورشید کو ہماری یہ تجویز بہت پسند آئی۔ لیکن انہوں نے کہا کہ ہمیں سیکرٹریٹ میں گھسنے کون دے گا؟ ہم نے مسٹر خورشید کے بے بنیاد خدشات رفع کرنے کے لئے انہیں اعتماد میں لے کر بتایا کہ آپ کو وزارت میں سیکرٹری نہ سہی ایک دو ڈپٹی سیکرٹری اور دو چار نوجوان سیکشن افسر ایسے ضرور مل جائیں گے جو آپ میں دلچسپی لیتے ہوں گے اور وہ آپ میں اور کمشن کی رپورٹ میں ذاتی دلچسپی لے کر کمشن کی سفارشات پر عمل کرادیں گے ورنہ اگر اس رپورٹ میں کسی بھی افسر نے "ذاتی دلچسپی" نہ لی تو آپ کے مخصوص مقام کا تعین نہ ہو سکے گا۔ مسٹر خورشید نے اپنی سیکرٹری کی طرف دیکھا جو پہلے ہی ہمارے قیمتی مشورے نوٹ فرما رہی تھیں۔

۴۔ ہم نے اپنے مہمانوں کو چوتھا مشورہ یہ دیا کہ آپ بیرون ملک جانے والے وفود میں اپنی نمائندگی کے بجائے حکومت سے یہ مطالبہ کریں کہ جس طرح تاجروں وغیرہ کے الگ وفود جاتے ہیں اس طرح ہجڑوں کے الگ وفود مختلف ممالک کے دورے پر

جانے چاہئیں۔ فرض کیا فروغ برآمدات کے کسی وفد میں آپ کا ایک نمائندہ شامل کر بھی لیا جائے تو وہ باہر جا کر کیا کرے گا؟ تاجر اور برآمد کنندگان اپنے اپنے ہم جنسوں یعنی وہاں کے تاجروں اور درآمد کنندگان سے ملاقاتیں اور باتیں چیتیں شروع کر دیں گے اور آپ اکیلے کسی چوک کے بیچ کھڑے رہ جائیں گے۔ آخر آپ کے پاس برآمد کے لئے ہے ہی کیا؟ یہی حشر دوسرے شعبوں کے وفود میں شامل ہونے سے ہوگا۔ لہٰذا آپ حکومت سے مطالبہ کریں کہ ہجڑوں کے نمائندوں پر مشتمل الگ وفود ترتیب دیئے جایا کریں۔

اس موقعہ پر مس عندلیب بولیں "یہ وفود باہر جا کر کریں گے کیا؟" صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی نے مس عندلیب کو ڈانٹا اور کہا "ایڈیٹر کو ٹوکتے نہیں۔ ایڈیٹر جو چاہے لکھے اور کہے۔ ایڈیٹر لوگ اپنے آپ پر تنقید پسند نہیں کرتے۔ پڑھے لکھوں کی محفل میں بیٹھنے کے کچھ آداب بھی سیکھو" مس عندلیب نے گردن جھکا لی لیکن ہم نے فخر سے اپنا سر اور بھی بلند کر لیا اور دل میں خوش ہو کر کہا "شکر ہے اللہ کا۔ کم از کم ہجڑے تو ایڈیٹر کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں" لیکن ہمیں مس عندلیب کی گردن جھکانے کی ادا بڑی پسند آئی اور ہم نے پروٹوکول کے برعکس صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی کو نظر انداز کرتے ہوئے مس عندلیب کو براہ راست مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ دیکھو عندلیب۔ آپ کے وفود بیرون ملک بہت سے اہم کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ پہلا فائدہ تو ظاہر ہے یہی ہے کہ آپ کو بیرونی دنیا کے اعلیٰ ہجڑوں سے ملاقات کا موقع ملے گا اور آپ کو معلوم ہوگا کہ ان لوگوں نے اپنے آپ کو کس طرح معاشرے میں ایڈجسٹ کر رکھا ہے اور اپنے آپ کو معاشرے کا مفید آرگن ثابت کرنے کے لئے کیا کیا طریقے یا حربے اختیار کر رکھے ہیں۔ لیکن قومی اور ملکی سطح پر آپ کے وفود سے حکومت کو بیرونی پبلسٹی کے محاذ پر بہت فائدہ ہوگا مس عندلیب۔ آپ جانتی ہیں ہر شخص کہتا ہے کہ ہماری بیرونی پبلسٹی بڑی کمزور ہے۔ جو پاکستانی کسی بھی دوسرے ملک کے

سفر سے واپس آتا ہے تو وہ یہ بات لازمی طور پر کہے گا کہ ہمارے سفارت خانوں کو اپنے اللّے تللّوں کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ صدر مملکت نے پچھلے سال جو فلاں اہم تقریر کی تھی اس کی کاپیاں وہاں سفارتخانہ کے برآمدہ میں ڈھیروں پڑی ہوئی تھیں اور کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ دو چار کاپیاں مقامی پریس میں تقسیم کر دیتے۔ مس عندلیب نے اس موقع پر کہا "جی ہاں۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں" یعنی مس عندلیب کو بھی ہماری کمزور بیرونی پبلسٹی کا واضح احساس تھا۔ ہم نے کہا مس عندلیب۔ گو ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ اگر ملک میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو آپ ملک سے باہر اس اندھیرے کو روشنی کے روپ میں نہیں دکھا سکتے۔ لیکن اس وقت ہم تو وفود کے فوائد کی بات کر رہے ہیں۔ عام وفود جو بیرون ملک جاتے ہیں تو وفود کے ارکان لندن، نیویارک یا پیرس وغیرہ پہنچتے ہی اپنے ہوٹل سے نہا دھو کر اور "ایوننگ ان پیرس" کا بے دریغ چھڑکاؤ کر کے باہر بازاروں میں نکلتے ہی اپنی اپنی مخالف جنس میں کھو جاتے ہیں۔ وہ سفید جنس کی دلدل میں اس طرح پھنس جاتے ہیں کہ پھر انہیں اپنا ہوش نہیں رہتا کہ وہ کون ہیں اور یہاں کیوں آئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک تو اس دلدل کے چھینٹے واپس پاکستان بھی لے آتے ہیں۔ ہم نے مس عندلیب سے کہا کہ آپ کی کمیونٹی کے وفود باہر بھیجنے کا دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ ان بشری کمزوریوں سے پاک ہوں گے جو عام طور پر بلکہ خاص طور پر ہم مردوں میں ہوتی ہیں اور آپ اپنا تمام وقت ملکی مفاد میں صرف کریں گے اور اگر کسی دوسرے ملک کے کسی بے خبرے نے آپ کے وفد کے کسی ممبر کی طرف غلطی سے ہاتھ بڑھا بھی دیا تو منہ کی کھائے گا اور بالآخر اپنا سا منہ لے کر رہ جائے گا۔ اب ہیجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی کے صدر خاموش نہ رہ سکے اور قدرے خفگی سے بولے "واہ ایڈیٹر صاحب۔ آپ بھی کمال کر رہے ہیں۔ آپ لوگ باہر جائیں تو عیش کریں اور ہم باہر جائیں تو اپنے منہ بند رکھیں۔ یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے؟" ہم نے کہا کہ بیرون ملک ہمیں

آپ کے صرف منہ کھلے رہنے کی حد تک کوئی اعتراض نہیں۔ ہم تو صرف یہ کہہ رہے تھے کہ ظاہر ہے کچھ آپ احتیاط سے کام لیں گے کچھ دوسرے پرہیز کریں گے۔ ایسوسی ایشن کی سیکرٹری تسنیم کوثر جو اپنے صدر کی ہدایات کے مطابق ہمارے قیمتی مشورے مسلسل نوٹ کر رہی تھی بولی: "لیکن ہم ہجولیوں کے وفد باہر بھیجے گا کون؟ اور ہمارا یہ مطالبہ مانے گا کون؟" ہم نے کہا کہ ہم آپ کے اس خدشہ کی طرف آنے ہی والے تھے اور یہاں سے ہمارا پوائنٹ نمبر ۵ شروع ہوتا ہے۔

۵۔ ہم نے کہا کہ آپ کے تمام مطالبات صرف اور صرف اس وقت پورے ہو سکیں گے جب آپ لوگوں میں اتحاد ہوگا۔ آج کل مطالبات صرف ان تنظیموں کے منظور ہوتے ہیں جو پہیہ جام کر سکیں۔ لہٰذا آپ سب سے پہلے پاکستان کے تمام ہیجڑوں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیئں۔ ایک "پاکستان فیڈریشن آف یونینز آف ہیجڑاز" یعنی پی ایف یو ایچ (معاف کیجئے PFUJ نہیں، بلکہ PFUH) قائم کریں۔ ہم نے مسٹر خورشید سے کہا بہتر ہوگا کہ آپ خود ہی پہلے PFUH کے کنوینر اور بعد میں تاحیات صدر بن جائیں پھر اس فیڈریشن کے زیرِ اہتمام اسلام آباد میں ایک تین روزہ "کل پاکستان ہیجڑہ کانفرنس" منعقد کریں۔ کانفرنس میں اسلامی معاشرے میں ہیجڑوں کے مخصوص مقام کے موضوع پر فکر انگیز مقالے پڑھے جائیں۔ مقالوں کے موضوعات کچھ اس طرح کے ہو سکتے ہیں :۔

ا۔ ہیجڑوں کی تعریف اور دورِ حاضر میں ہیجڑوں کا مقام۔

ب۔ قوموں کے عروج و زوال میں ہیجڑوں کا کردار۔

ج۔ مردوں کے ہیجڑے بننے کے مختلف مراحل — ایک نفسیاتی جائزہ

د۔ ہیجڑے برائے ہیجڑے اور ہیجڑے برائے زندگی۔

ہ۔ ہیجڑوں کی قسمیں — جسمانی و ذہنی۔

ک۔ برصغیر میں ہیجڑوں کے فروغ کا پس منظر۔ تاریخ کے حوالے سے۔

ہم نے کہا کہ کانفرنس کی آخری نشست جس میں کہ قرار دادیں اور سفارشات پیش کی جائیں گی کی صدارت کسی مرکزی وزیر یا مشیر سے کرائی جائے۔ ظاہر ہے کہ صدر گرامی قدر اپنے صدارتی خطبے میں حسب روایت آپ کے مطالبات پر "ہمدردانہ غور" کا وعدہ کریں گے اور اس طرح آپ کے مطالبات پورے ہونے کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔

ہمارے قیمتی مشورے سن کر صدر ہجڑہ ایسوسی ایشن راولپنڈی کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی وہ خلاؤں میں گھورنے لگے۔ اس لئے کہ ایک تو وہ PFUH کے تاحیات صدر مقرر کر دیئے گئے تھے اور دوسرے وہ چشم تصور سے اپنے آپ کو لندن، پیرس اور نیویارک وغیرہ کی سڑکوں پر خراماں خراماں چلتے محسوس کر رہے تھے۔ صدر صاحب بولے: "ایڈیٹر صاحب۔ آپ نے ہمارے چودہ طبق روشن کر دیئے ہیں۔ مِس تسنیم کوثر، مس عندلیب شکریہ ادا کرو ایڈیٹر صاحب کا"۔ تسنیم کوثر نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی یعنی بندہ/بندی حاضر ہے کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔ جبکہ مس عندلیب نے اپنے دائیں ہاتھ کی چار انگلیاں ماتھے پر رکھتے ہوئے آداب عرض کہا۔ صدر صاحب نے کہا "نہ جانے یہ گورنمنٹ ہمارے ساتھ کیا کرنا چاہتی ہے"۔ نہ جانے اچانک ہمارے دل میں کیا خیال آیا کہ ہم نے صدر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "معاف کیجئے: آپ لوگوں سے ایک ذاتی سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ آپ کے ہاں اولاد کس طرح ہوتی ہے؟" صدر صاحب بہت شرمائے۔ کہنے لگے "ہائے ایڈیٹر صاحب۔ آپ تو بڑے شرارتی ہیں۔ میری تو شادی بھی نہیں ہوئی اور یہ دونوں ابھی کنواری ہیں"۔

پولیس رے پولیس.....

ممکن ہے آپ اس سے اتفاق نہ کریں۔ لیکن ہمارا ذاتی خیال ہے کہ جو ملک جس قدر ترقی یافتہ ہوتا ہے اس کی پولیس فورس اتنی ہی مہذب اور عوام دوست ہوتی ہے دوسرے لفظوں میں پولیس کی اخلاقی بلندی یا پستی سے اس ملک کے معاشرتی، معاشی اور اخلاقی قدو قامت کو ناپا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر پولیس کی جسمانی "صحت" کو کسی ملک کی ترقی کا معیار قرار دیا جائے تو پاکستان دنیا بھر میں اوّل پوزیشن حاصل کر کے طلائی تمغہ جیت سکتا ہے۔ ایک زمانے میں ہم نے برطانیہ کی پولیس کی بڑی شہرت سن رکھی تھی لیکن یہ شہرت اس وقت محض کھوکھلا پراپیگنڈہ ثابت ہوئی جب ہم نے خود لندن میں گھوم پھر کر دیکھا۔ جس طرح ہم خود سنگل باڈی کی شخصیت ہیں اسی طرح وہاں کی پولیس بھی ہمیں مریل مریل سی نظر آئی۔ اس کے برعکس جب ہم واپس پاکستان آئے تو کراچی کے ہوائی اڈے پر ہی ایک تنومند بلکہ تو ندمند تھانیدار کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔

صاحبِ ذوق خواتین و حضرات جانتے ہیں کہ دنیا بھر کی حسیناؤں کے سالانہ جھرمٹ میں سے جس صحت مند اور خوش شکل خاتون کو حسینہ عالم چُنا جاتا ہے اس کے اعضائے رئیسہ

اوران کی زبان میں Vital Statistics عام طور پر ۴۵-۲۲-۴۵ ہوتے ہیں۔ یعنی چھاتی ۴۵ انچ۔ کمر ۲۲ انچ اور وغیرہ ۴۵ انچ۔ حسیناؤں کے ان مقابلوں میں عام طور پر یورپ یا امریکہ ہی کی کوئی غنچہ دہن اوّل قرار دی جاتی ہے۔ اس لئے کہ وہاں کی خواتین اپنے جسم کے ایک ایک عضو کا خیال رکھتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہماری جسیم پولیس اپنے جُسے (جسم) کا خیال رکھتی ہے اور اگر دنیا بھر کی پولیس کے مقابلہ صحت کا اہتمام کیا جائے تو دنیا دیکھے گی کہ کوئی پاکستانی جوان ہی مسٹر پولیس کا ٹائیٹل جیتے گا اور اس کے اعضائے رئیسہ ہوں گے ۳۵-۷۰-۳۵ یعنی چھاتی ۳۵ انچ۔ پیٹ ۷۰ انچ اور وغیرہ وغیرہ ۳۵ انچ۔ اور اس طرح جہاں ہماری چند اور خوبیوں سے پاکستان دنیا بھر میں جانا پہچانا اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے وہاں پولیس مقابلوں میں ہماری اعلیٰ کارکردگی سے ہماری بین الاقوامی شہرت اور نیک نامی میں اور اضافہ ہوگا۔

ہمارے دوست اکثر ہم سے پوچھتے رہتے ہیں کہ آپ یوں پولیس کے معاملات میں خصوصی دلچسپی کیوں لیتے رہتے ہیں۔ ہم حلفیہ بیان کرتے ہیں کہ اس دلچسپی کی اس کے علاوہ اور کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی پولیس کے دل سے مداح ہیں۔ یوں تو ہم نے کئی ایک ایسی روح افزا اور ایمان افروز داستانیں سن رکھی تھیں جن کی بنا پر ہم اپنی پولیس کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن جب سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کس طرح پولیس کے ایک محافظ نے ٹیکسلا میں دریافت ہونے والے گوتم بدھ کے ایک بہت پرانے مجسمے کی عمر بڑی کامیابی سے معلوم کر لی تھی اس وقت سے ہم پولیس کی پولیسانیوں کے دل و جان سے قائل ہو گئے ہیں۔ دیمک خوردہ مجسمے کی صحیح صحیح عمر دریافت کرنے کے اس حیرت انگیز واقعہ کا ذکر ہم سے ٹیکسلا میوزیم کے ایک نگران نے کیا تھا۔ موصوف نے بتایا کہ عمرانیات کے چند بین الاقوامی ماہرین ٹیکسلا سے دریافت ہونے والے اس مجسمے کی عمر معلوم کرنے کے لئے ہر روز کھودی ہوئی ایک غار کے اندر داخل ہوتے اور

مختلف اشیاء کا تجزیہ کر کے اس کی عمر کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتے مگر کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکتے۔ محافظ پولیس کے ایک افسر نے ان سے پوچھا کہ آپ لوگ ہر روز اندر جا کر کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے بتایا کہ ہم مجسّمے کی عمر معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ پولیس افسر نے کہا کہ ایک روز مجھے اندر جانے دیں میں معلوم کر دوں گا۔ ماہرین نے اسے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ چند منٹوں کے بعد وہ افسر باہر آیا اور بتایا کہ مجسّمے کی عمر پانچ ہزار تین سو بہتر سال اور آٹھ مہینے ہے۔ ماہرین کے منہ کھُلے کے کھُلے رہ گئے اور انہوں نے پوچھا کہ آپ نے یہ عمر کیسے معلوم کر لی؟ پولیس افسر نے کہا "جی۔ اندازہ کیا لگانا تھا۔ دسویں جوتے پر یہ خود ہی بک پڑا ہے"

ہم تو اپنی پولیس کے شروع ہی سے مداح تھے اور اُس زمانے میں ہمارے بعض دوست ہماری اس پولیس پسندی پر ہنسا کرتے تھے۔ لیکن چند دن پہلے ہم نے نوٹ کیا کہ ہمارے بعض نقاد بھی اب نہ صرف پولیس کی تعریف پہ تعریف کئے جا رہے ہیں بلکہ پولیس قربت کے خواہشمند بھی نظر آ رہے ہیں۔ لیکن ہم اس اچانک تبدیلیِ قلب کا پس منظر نہ سمجھ سکے۔ اسی طرح ہمارے ایک صحافی دوست شعبہ پولیس میں "حالیہ توسیع" کو ہر وقت حکومت کا ایک مثبت اقدام قرار دیتے رہتے۔ بڑے دنوں بعد ہم پر یہ راز کھلا کہ ہمارے دوستوں کی تبدیلیِ قلب کی وجہ اور "حالیہ توسیع" سے مراد پولیس اور خاص طور پر ٹریفک پولیس میں زنانہ بھرتی ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک محض پولیس میں زنانہ اضافہ کوئی خاص ایسی بات نہ تھی جس کی وجہ سے پولیس سے یاری دوستی کو جی چاہے۔ ہمارا کہنا تھا کہ پولیس پولیس ہوتی ہے خواہ زنانہ ہو یا مردانہ۔ پولیس کو ایک ہی طرح کے فرائض انجام دینا ہوتے ہیں۔ مردانہ اور زنانہ پولیس کی اس درجہ بندی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارے دوستوں کا موقف یہ ہے کہ مرد پہلے مرد ہوتا ہے اور پھر کچھ اور۔ اسی طرح عورت ہر حالت میں عورت ہی ہوتی ہے اس

لئے زنانہ پولیس دراصل زنانہ پہلے ہے اور پولیس بعد میں۔ اتفاق سے انہی دنوں اخبارات میں ایک خبر شائع ہوئی جسے ہمارے دوستوں نے اپنی مردانہ دلیل کے حق میں استعمال کیا۔ یہ خبر کچھ یوں تھی :۔

لیڈی کانسٹیبل کی آبروریزی کرنے کی کوشش

راولپنڈی ۳۰ مئی (اپنے سٹاف رپورٹر سے) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج مسٹر خضر حیات خان نے لیڈی کانسٹیبل مجاہدہ بانو کی مبینہ طور پر آبروریزی کرنے کی کوشش کرنے والے اسسٹنٹ سٹیٹ افسر محمد یار کی درخواست ضمانت پر غور کرنے کے لئے چھ جون کو مقدمہ کا ریکارڈ طلب کر لیا ہے۔ محمد یار قانونِ شریعت کی دفعہ ۱۶ اور تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۳۷۶، ۵۱۱ کے تحت چند روز قبل گرفتار کئے گئے تھے۔ ایف آئی آر کے مطابق انہوں نے لیڈی پولیس کانسٹیبل مجاہدہ بانو کی جبراً آبروریزی کی کوشش اپنے گھر میں کی تھی۔ انہیں موقعہ پر برہنہ حالت میں گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اِن کی طرف سے درخواست ضمانت میں یہ مؤقف اختیار کیا گیا ہے کہ وہ معزز اور تعلیم یافتہ افسر ہیں، لیڈی کانسٹیبل نے قرض لیا تھا اور واپس نہیں کرتی تھی مزید برآں ان کو ایک جال میں پھنسا کر یہ جھوٹا مقدمہ درج کرایا گیا۔ فاضل جج نے درخواست ضمانت پر غور کرنے کے لئے آبپارہ پولیس سے چھ جون کے لئے ریکارڈ طلب کر لیا ہے۔

ہمارے صحافی دوست کا کہنا ہے کہ مذکورہ کانسٹیبل اگر مجاہدہ بانو نہ ہوتی بلکہ مجاہد خان ہوتا تو یہ ناخوشگوار واقعہ نہ ہوتا۔ ان کی اس دلیل اور وزنی ثبوت نے ہمیں کسی حد تک اپنی رائے بدلنے پر مجبور کر دیا ہے اور اب ہم سوچ رہے ہیں کہ ویسے تو راہ چلتی عام خاتون سے بھی اگر مبینہ طور پر زیادتی کی جائے تو ملزم کو سخت سے سزا دی جانی چاہیئے۔ اور ملزم کو کم از کم پچاس ساٹھ کوڑے مارنے چاہئیں۔ لیکن اگر کوئی مشٹنڈا لیڈی کانسٹیبل سے فحش حرکات کرتا پکڑا جائے تو اُسے کم از کم سو ڈیڑھ سو کوڑے مارے جائیں۔ اس لئے کہ ہمارے نزدیک لیڈی کانسٹیبل سے فحش حرکات کرنے کا سیدھا سادا مطلب یہ ہوگا کہ ملزم (خدانخواستہ) حکومت سے فحش حرکات کر رہا ہے۔ اسی طرح لیڈی کانسٹیبل سے بر سرِ عام بوس و کنار کا مرتکب ہونے والے غنڈے کو کم از کم دو اڑھائی سو کوڑوں کی عبرتناک سزا دینی چاہیئے۔ اس لئے کہ اس فعلِ بد سے مراد یہ ہوگی کہ ملزم اس حد تک دیدہ دلیری کا ارتکاب کر رہا ہے کہ (خاکم بدہن) اب اس نے حکومت سے بھی بوس و کنار شروع کر دیا ہے۔ نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہم نے تو یونہی مثال کے طور پر یہ سب کچھ عرض کیا ہے۔ ورنہ حکومت سے بوس و کنار اور وہ بھی بر سرِ عام! بھلا کون جرأت کرے گا۔ خود ہم آگے بڑھ کر ایسے شر پسند کا ہاتھ وغیرہ توڑ دیں گے جو ہماری محبوب حکومت سے اس طرح کی حرکت کرے گا۔ ویسے ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر کوئی ناہنجار لیڈی کانسٹیبل سے فحش حرکات کرتا پکڑا جائے تو اُس کا منہ سونگھا جائے اور لیڈی کانسٹیبل کا ڈاکٹری معائنہ کرایا جائے تو ملزم یقینی طور پر اپوزیشن کا کوئی رکن ہوگا۔ ایسے شر پسند کو لاہور کے شاہی قلعے لے جایا جائے تو سب بک پڑے گا کہ آخر حکومت کو بدنام کرنے کا یہ لندن پلان کس کے ذہن کی تخلیق ہے۔ اس سازش کے پیچھے خفیہ ہاتھ کس کا ہے۔ دو مزید جوتے لگنے کے بعد ملزم یہ بھی بتا دے گا کہ اس خفیہ سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے فنڈز سی۔ آئی۔ اے سے آ رہے ہیں یا کے جی بی سے؟ ہم حکومت کو مخلصانہ مشورہ دیں گے کہ اگر اپوزیشن کا اس طرح کے کسی انتہائی افسوسناک واقعہ میں ملوث ہونے کا ثبوت

مل جائے تو صرف یہی سنگین جرم اس کارکن کی سیاسی پارٹی پر ہمیشہ کے لئے پابندی لگا دینے
کے لئے کافی ہوگا۔ اور ایسی صورت میں عدلیہ کی رائے لینا بھی غیر ضروری ہوگا۔

اپنے صحافی دوست کے مؤقف نے ہماری سوچ بدل کر رکھ دی ہے۔ ہم انہی خیالاں میں غلطاں تھے کہ اُدھر بھارت کے شہر مدراس سے بھی ایک لیڈی کانسٹیبلانہ خبر آگئی ہے۔ خبر کے مطابق بھارت کے صوبہ تامل ناڈو میں انسپکٹر جنرل پولیس کے لئے ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے وہ یہ کہ ان کی ایک سینئر لیڈی پولیس افسر کا پاؤں بھاری ہے۔ تامل ناڈو میں پولیس کی خواتین افسروں کو بھی پتلون پہننا ہوتی ہے۔ لیڈی افسر کا کہنا ہے کہ پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے میں پتلون نہیں پہن سکتی، لہٰذا جب تک میں بچے کو جنم نہ دے لوں مجھے پتلون کی جگہ ساڑھی پہننے کی اجازت دی جائے۔ خبر کے مطابق انسپکٹر جنرل پولیس کہتے ہیں کہ پولیس رولز کسی افسر کو بغیر وردی ڈیوٹی پر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اب انہوں نے یہ درخواست صوبائی حکومت کو روانہ کر دی ہے۔ اب اگر اس لیڈی افسر کو دوران حمل ساڑھی پہننے کی اجازت دی گئی تو اس کا اطلاق دوسری افسروں پر بھی ہوگا۔ ہمارے صحافی دوست کا کہنا ہے کہ اب بتائیے زنانہ پولیس پہلے زنانہ اور پھر پولیس ہے کہ نہیں؟ چنانچہ اب ہم نے جب اس لائن پر سوچنا شروع کیا تو معلوم ہوا کہ ہمارے دوست کی تحقیق کے نتائج برحق ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ بڑے شہروں کے جن چند چوراہوں پر زنانہ ٹریفک پولیس متعین ہے وہاں دھڑا دھڑ حادثات ہو رہے ہیں۔ بسوں، کاروں اور رکشہ ڈرائیوروں اور سکوٹر سواروں کی نظریں زنانہ ٹریفک کانسٹیبل کی نئی یونیفارم کی طرف لگی ہوئی ہیں اور گاڑیاں ایک دوسرے پر چڑھ رہی ہیں۔ بیچاری کانسٹیبل کہتی ہے "ہائے اللہ۔ ہمارے لئے تو ہر جگہ مصیبت ہے" پھر ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ لوگ اور خاص طور پر کالجوں کے نوجوان طلبا جب اپنے مطالبات منوانے کے لئے سڑکوں پر نکل آتے ہیں تو اُس موقع پر جہاں جہاں زنانہ پولیس متعین ہوتی ہے وہاں وہاں مظاہرین کا زور زیادہ ہوتا ہے اور ہر طالب علم آگے بڑھتا ہے

کانسٹیبل پہلا وار اسی پر کرے۔

معاف کیجئے بات کہاں کی کہاں چلی گئی۔ ہم نے تو صرف اس اعتراف حقیقت کے اظہار کے لئے مضمون شروع کیا تھا کہ ہم دل و جان سے پولیس کے مداح ہیں لیکن بات شروع ہو گئی پولیس کی تذکیر و تانیث کی۔ ہاں تو ہم واقعی اپنی پولیس کے بڑے مداح اور خیر خواہ ہیں دنیا کے مختلف ممالک کی پولیس نے ملزموں سے راز اگلوانے یا چوری ڈاکے کا اعتراف کرانے کے جو (ان کی اپنی نظر میں) جدید ترین طریقے اور نفسیاتی حربے ایجاد کر رکھے ہیں وہ ہمیں اپنی شیر دل پولیس کی لتر بازی کے سامنے ہیچ نظر آتے ہیں۔ جب پولیس کا جوان (خاص طور پہ پنجاب پولیس کا جوان) ہاتھ میں لتّر لے کر ملزم سے کہتا ہے "اوے شکرے۔ اِدھر آ۔ اُلٹا لیٹ جا۔ ذرا دیکھیں تم کتنے بڑے سورما ہو" اور اس کے ساتھ ہی وہ ایک دھماکہ خیز لتّر لگاتا ہے تو ملزم کی "ہائے" سے سوئے ہوئے قیدی جاگ اٹھتے ہیں۔ اسی طرح جب چند لتّر پڑتے ہیں تو ملزم کہہ اٹھتا ہے "جناب ٹھہریئے۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں"۔ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے صرف ایک بار اس طرح سائنٹفک بنیاد پر تفتیش ہوتے دیکھا ہے۔ ان دنوں ہم لاہور یونیورسٹی میں زیر تعلیم تھے۔ ہمارے ایک کالج کے دوست کی تھانہ گوجر سنگھ میں بطور سب انسپکٹر تقرری ہو گئی۔ ایک دن وہ ہمیں بڑا اصرار کر کے اپنے تھانے لے گئے گرمیوں کی شام تھی۔ تھانے کے صحن میں دو چار پائیاں آمنے سامنے بچھی تھیں اور ان پر پولیس کے تین چار کڑیل جوان بیٹھے تھے۔ چار پائیوں کے درمیان زمین پر ایک دبلا پتلا کوئی چالیس سالہ شخص سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ملزم کے پاس ایک کالے رنگ کا لکڑی کا صندوق پڑا تھا جس پر سفید رنگ سے لکھا ہوا تھا "آلات برآمدگی سامان مسروقہ"۔ ہمارے دوست ہاشمی نے پوچھا "یہ کون ہے؟" معلوم ہوا یہ رحمو ہے۔ جو فلم پروڈیوسر مجید کے پانچ سو روپے لے کر بھاگ گیا تھا۔ باؤ جی یعنی ہمارے لئے کرسی منگوائی گئی۔ اس کے بعد ہم نے تفتیش کو بڑی خوبصورتی سے آگے بڑھتا دیکھا:-

ایک سپاہی :۔ "اوئے ۔قمیض اتارو"۔ رحمو سپاہی کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھتا ہے اور پھر بے بسی کے عالم میں قمیض اتار دیتا ہے۔ سپاہی غور سے رحمو کے جسم کا جائزہ لیتا ہے۔

وہی سپاہی :۔ (سب انسپکٹر کو مخاطب کرتے ہوئے) جناب ذرا اس کی ہڈیاں دیکھیں

دوسرا سپاہی :۔ ہوں ...... ہیرا منڈی جاتا ہوگا۔

پہلا سپاہی رحمو کو پاؤں کی ٹھوکر مارتا ہے۔ رحمو پرے جا گرتا ہے۔ سپاہی گرج کر کہتا ہے "اوئے ہیرا منڈی جاتے ہو"؟

رحمو :۔ (ہاتھ جوڑتے ہوئے) نہیں جناب میں تو غریب آدمی ہوں وہاں کبھی نہیں گیا۔

دوسرا سپاہی :بہن...... بکواس کرتے ہو۔ اور اس کے ساتھ ہی اس نے کالے صندوق سے کوئی ڈیڑھ فٹ لمبا لتّر یعنی جوتا نکالا اور رحمو کے سر پر دے مارا۔

رحمو :۔ (جلدی جلدی) ہاں جناب کبھی کبھار چلا جاتا ہوں۔

سب انسپکٹر :۔ (گردن ہلاتے ہوئے) "ہوں"

تیسرا سپاہی :۔ (طنزیہ انداز میں) سنا ہے تم اپنی بھابی سے بھی ......

رحمو :۔ (آنکھوں میں آنسو لئے) جناب میری تو کوئی بھابی ہے ہی نہیں۔

وہی سپاہی :۔ (اپنی توہین محسوس کرتے ہوئے ایک زوردار لتّر لگاتا ہے) تمہاری بھابی ہی کوئی نہیں ؟

رحمو :۔ (درد سے کراہتے ہوئے) ہئے ۔ جناب ۔ ہئے

ہم اس طرح سائنٹفک بنیاد پر آگے بڑھتی ہوئی تفتیش کو مشکل سے دس منٹ ہی دیکھ سکے ۔ ہمیں یوں محسوس ہونے لگا جیسے ہم خود رحمو کی جگہ نظریں نیچے کئے بیٹھے ہیں۔ ان دس منٹوں میں فلم پروڈیوسر مجید کے پانچ سو روپے کا ذکر تک نہیں آیا۔ آج تک یہ مکالمے ہمارے دل و دماغ میں میخوں کی طرح پیوست ہیں۔

ہمارے صحافی دوست سے جب بھی پولیس کے موضوع پر گفتگو ہوتی ہے تو وہ

کہتے ہیں کہ پولیس کی کرپشن ختم کرنے کے لئے ایک الگ اینٹی کرپشن شعبہ کھولا جانا چاہیئے
ہم کہتے ہیں پھر اس اینٹی کرپشن ڈیپارٹمنٹ کی کرپشن روکنے کے لئے ایک انٹی۔انٹی کرپشن
ڈیپارٹمنٹ قائم کرنا پڑے گا اور پھر ایک تیسرا اینٹی۔اینٹی۔اینٹی کرپشن شعبہ شروع کرنا
پڑے گا اور اس طرح ملک میں کئی ایک اینٹی۔اینٹی۔اینٹی۔اینٹی۔اینٹی........

اس لئے ہمارا موقف یہ ہے کہ جب تک ہم سب خود اپنی اصلاح نہ کریں گے جسیم
پولیس کا جسہ بڑھتا رہے گا۔آنے والے دور میں اس کے اعضائے رئیسہ ۳۵-۱۰۰۔
۳۵ ہو جائیں گے۔زنانہ پولیس کا پاؤں بھاری ہوتا رہے گا اور رحمو ہیرا منڈی
جاتا رہے گا۔

اسبابِ زوالِ اُمّت

ہمیں بچپن ہی سے قوموں کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھنے کا شوق رہا ہے ہم ایسی دلچسپ اور سبق آموز داستانیں ادھر ادھر سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر پڑھا کرتے تھے. اب بڑھاپے میں ہم اقوام کے عروج و زوال کی داستانیں پڑھنے کے بجائے بچشم خود دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے مطابق کئی اقوام کے عروج و زوال میں حصہ بھی لے رہے ہیں۔ خیر اس وقت ہم اپنے کارناموں کا ذکر نہیں کرتے اور یہ کام آیندہ کے مؤرخین پر چھوڑتے ہیں کہ وہ ہمیں تاریخ میں کون سا مقام دیتے ہیں۔ ہم نے نوٹ کیا ہے کہ جب بھی مورخ کسی بادشاہ، شہنشاہ یا کسی خاندان کی حکومت کے قیام کے متعلق لکھتا ہے تو چند ہی صفحات کے بعد وہ اس بادشاہ، شہنشاہ یا خاندان کے زوال کے اسباب کا ذکر شروع کر دیتا ہے۔ البتہ بعض خاندانوں کی فتوحات، کارناموں اور اصلاحات وغیرہ پر صفحات کے صفحات کالے کر دیئے گئے۔ بہر حال سکولوں و کالجوں کے تاریخ کے طلبا سے اب تک یہ پوچھا جاتا ہے کہ فلاں خاندان کے زوال کے دس بڑے اسباب لکھو.

تاریخ کے اس گہرے مطالعہ کی روشنی میں جب ہم اپنے حالات و واقعات کا

جائزہ لیتے ہیں اور قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک مختلف نمایاں رجحانات کا تجزیہ کرتے ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ہر لحاظ سے اپنی قوم میں عروج ہی عروج کے آثار نظر آتے ہیں اور ہم نہیں سمجھتے کہ دنیا کا کوئی بھی مورخ ہماری قوم کے (خدانخواستہ) زوال کا سوچ بھی سکتا ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ماضی کی ریت کے گھروندوں کی طرح گر جانے والی حکومتوں اور مملکتوں کا بھی کوئی زیادہ قصور نہ تھا۔ آخر ان اقوام کے پاس ہوتا ہی کیا تھا؟ بادشاہ سلامت، ملکہ عالیہ اور اور دس بارہ درجن مختلف رنگ روپ کے شہزادوں اور شہزادیوں کے علاوہ بس یہی دو تین جنگجو سپہ سالار، ایک آدھ پوپ یا مذہبی رہنما چند ایک سوچ بچار کرنے اور وقت بے وقت مشورہ دینے والے مشیر، ایک دو خمیرے اور کشتے بنانے والے حکیم۔ بے شک کسی کسی کے پاس دو چار ہاتھی اور دس بیس گھوڑے بھی ہوتے تھے جن کو مالشئے ہر وقت مالش کرتے رہتے تھے۔ لیکن جس چیز سے اللہ تعالیٰ نے ان اقوام کو بالکل ہی محروم کیا ہوا تھا وہ چیز یہ تھی کہ یہ بدقسمت لوگ ممتاز رہنماؤں سے خالی تھے۔ ان کے ہاں اگر کوئی ممتاز رہنما ہوتے بھی تھے جن سے قوم رہنمائی حاصل کر سکتی تو بس ایک دو ہی ہوتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ملک کی قسمت کو سنوارنا اور قوم کو زوال سے بچانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہے کہ یہ مملکت خداداد پاکستان اس دولتِ خداوندی سے مالا مال ہے۔ ماضی کی طرح اُن ممالک میں آج بھی قحط الرجال ہے۔ اب ان نام نہاد بڑی بڑی جمہوریتوں کو ہی لے لیجئے۔ ان کے پاس ہے ہی کیا۔ کسی ملک میں دو سیاسی پارٹیاں ہیں اور کسی میں تین۔ جبکہ ہمارے ہاں حکومت کی ایک اطلاع کے مطابق اس وقت چھہتر سیاسی پارٹیاں عوام کی خدمت میں دن رات مصروف ہیں بلکہ دن سے بھی زیادہ رات کو مصروف رہتی ہیں۔ اُن ملکوں میں دراصل نام نہاد صنعتی انقلابوں کی وجہ سے ایک نفسا نفسی کا عالم ہے۔ ہر شخص دوسروں کے دکھ درد اور مسائل سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں مگن نظر آئے گا۔ ان کے برعکس ہمارے ہاں لوگ دوسروں کی فلاح و بہبود کا پہلے

سوچتے ہیں اور اپنے اور اپنے عزیز و اقارب کے متعلق بعد میں۔ کسی بھی دن کا کوئی بھی اخبار پڑھ لیں۔ کسی نئی تنظیم، نئی سیاسی جماعت، انجمن، ایسوسی ایشن یا فیڈریشن کے قیام کا اعلان نظر آئے گا۔ پوچھ بھائی کیا بات ہے۔ یہ نئی تنظیم کیوں بنا ڈالی۔ جواب ملے گا۔ ہم بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ قیام پاکستان کا مقصد لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا ہے۔ غریب غریب تر اور امیر امیر ترین ہوتا جا رہا ہے۔ اس لئے ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اب ایسا نہیں ہونے دیں گے اور عوام کو ان کے حقوق دلا کر رہیں گے۔ پھر چند دنوں کے بعد معلوم ہوگا کہ اس نئی جماعت کے دو دھڑے ہو گئے ہیں۔ پھر دو سے چار۔ اور چار سے آٹھ اس لئے نہیں ہو سکے کہ اس نئی قومی جماعت میں کُل ممتاز رہنما ہی چار تھے۔ عوام کے حقوق کی نگہداشت کا یہ سلسلہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک جاری ہے اور اب تک طرح طرح کی اتنی جماعتیں بن چکی ہیں کہ پاکستان کے تقریباً ہر شہر میں سانس لینے والا ہر شہری کسی نہ کسی جماعت یا انجمن کا عہدیدار ہے۔ اگر کوئی صاحب ایسے مل جائیں جو پاکستان کی کسی بھی تنظیم کے کوئی بھی عہدہ دار نہ ہوں تو ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ پھر یہ صاحب پاکستانی نہ ہوں گے۔ ایسے صاحب اور تو سب کچھ ہو سکتے ہیں مگر پاکستانی ہرگز نہیں ہو سکتے۔

ہم کبھی حکومت سے اختلاف نہیں کرتے۔ لیکن پاکستان میں سیاسی جماعتوں کی سرکاری تعداد سے بصد ادب اختلاف کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ حکومت نے کسر نفسی سے کام لیا ہے اور ان قومی سیاسی جماعتوں کی تعداد کو بہت کم کر کے دکھایا ہے۔ چھہتر سیاسی جماعتیں!!! نہیں صاحب! ہم نہیں مانتے۔ ممکن ہے اس کسر نفسی سے کام لینے میں کوئی قومی مصلحت ہو مثلاً ہو سکتا ہے حکومت سمجھتی ہو کہ اگر ان جماعتوں اور ممتاز رہنماؤں کی کل تعداد صحیح صحیح بتا دی گئی تو دشمنوں کی نظر بھی لگ سکتی ہے۔ اگر کوئی ایسی قومی مصلحت ہے اور حکومت نے سیاسی جماعتوں کی تعداد ظاہر کرنے میں کوئی وسیع تر ملکی مفاد سامنے رکھا ہے تو پھر ہم

بھی تفصیل میں نہیں جاتے اور حکومت سے تعاون کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم خود ہزاروں ممتاز رہنماؤں کو جانتے ہیں جو بڑی بڑی قومی جماعتوں کے عہدیدار ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسی جماعتیں بھی ہیں جن کی چاروں صوبوں میں شاخیں بھی ہیں۔ ہم نے خود کئی ایسی شاخیں دیکھی ہیں۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ ہم کراچی میں اپنے ایک دوست سے ملنے اس کے فلیٹ پر گئے۔ اس فلیٹ سے ملحقہ ایک کمرے کے باہر کوئی درجنوں چھوٹے بڑے اور رنگ برنگے بورڈ نظر آئے۔ انہی بورڈوں میں "آل پاکستان غریب عوامی پارٹی۔ کراچی شاخ" کا ایک بورڈ بھی تھا۔ "پاکستان دستوری پارٹی۔ کراچی شاخ" کا بھی ایک چھوٹا سا بورڈ آویزاں تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک وکیل صاحب کا دفتر ہے وہ خود بھی کئی انجمنوں کے صدر اور کنوینر وغیرہ ہیں اور اسی دفتر کے مختلف کونوں، الماریوں اور الماریوں کے مختلف خانوں، میزوں اور میزوں کے مختلف خانوں میں کئی قومی جماعتوں کی شاخیں پھیلی ہوئی ہیں۔ کمرے کے باہر بورڈوں کا جال دیکھ کر اور کمرے کے اندر قومی جماعتوں کی شاخوں کے جنگل کے متعلق سن کر ہمارا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ کون کہتا ہے پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ بڑے ملکوں میں دو دو تین تین جماعتیں ہوں تو وہ ترقی یافتہ اور ہمارے ہاں ہزاروں جماعتیں اور لاکھوں انجمنیں بھی ہوں تو ہم ترقی پذیر!! واہ۔ یہ خوب انصاف ہے۔ لیکن پھر ہماری طبیعت کچھ بجھ سی گئی اور ہم نے اپنے دوست سے کہا۔ "کچھ عرصہ بعد یہ "کاشانہ رحمت" جس میں کہ تمہارا فلیٹ ہے گر جائے گا۔" ہمارے دوست نے حیران ہو کر پوچھا "وہ کیوں؟"۔ ہم نے بتایا کہ ہمیں باغبانی کا شوق ہے اور ہم جانتے ہیں کہ کسی ایک جگہ اتنی گھنی شاخیں اس امر کا ثبوت ہے کہ زیر زمین بھی بہت کچھ ہے اور بہت کچھ ہو چکا ہو گا۔ ان شاخوں سے آپ بخوبی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ان کے نیچے جڑیں ہی جڑیں ہیں۔ جڑوں کا ایک تانا بانا ہے۔ کچھ جڑیں تو اس فلیٹ کے نیچے زمین سے خوراک حاصل کر رہی ہوں گی اور کچھ جڑیں اتنی دور اور گہری چلی گئی ہوں گی کہ دوسرے

فلیٹوں کی زمین میں داخل ہو چکی ہوں گی اور اسی زمین سے خوراک حاصل کر رہی ہوں گی۔ اتنی شاخوں کا یہ مطلب بھی ہے کہ ان کی چھوٹی بڑی جڑوں کا یہ جال کچھ عرصہ بعد وہ زمین ہی چٹ کر جائے گا جس سے یہ خوراک حاصل کرتی ہیں اور ان جڑوں کا یہ مطلب بھی ہے کہ مستقبل قریب میں وہ فلیٹ کی دیواروں میں بھی اس قدر دراڑیں پیدا کر دیں گی کہ کسی طوفانی آندھی کے ایک ہی تھپیڑ سے یہ فلیٹ گر جائے گا۔ ہمارے دوست نے کہا کہ پھر یہ خطرہ صرف "کاشانۂ رحمت" ہی کو نہیں بلکہ پورے "کاشانۂ قائداعظم محمد علی جناح" کو ہے۔

عوام کی خدمت کے قابلِ تعریف جذبے سے بھرپور ان سینکڑوں ہزاروں جماعتوں کی موجودگی سے ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کبھی کبھار ہماری آنکھوں کے سامنے وہ منظر گھوم جاتا ہے جو ہم نے کئی دفعہ بسوں کے اڈے پر دیکھا ہے جونہی کسی بس سے مسافر اترتے ہیں خدمت خلق کے جذبہ سے سرشار تانگے والے آگے بڑھتے اور مسافروں کو اپنے اپنے تانگے پر بیٹھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک "آؤ جی۔ باؤ جی۔ ادھر بیٹھو" دوسرا: "باؤ جی ادھر سامان رکھو تانگہ تیار ہے" تیسرا: "لاؤ ماں جی۔ سامان مجھے دیں اور تانگہ پر بیٹھیں"۔ چوتھا: "آؤ جی سٹیلائٹ ٹاؤن چلنا اے" وغیرہ وغیرہ۔ کچھ تانگے والے سواریوں کو بازوؤں سے پکڑ لیتے ہیں اور اپنے اپنے تانگے کی طرف باقاعدہ کھینچنے لگتے ہیں۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ سامان ایک کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور صاحبِ سامان دوسرے تانگے والے کی گرفت میں ہوتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی سواری کا ایک بازو ایک تانگے والے کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا دوسرے کے ہاتھ میں۔ اس کشمکش اور کھینچا تانی میں ہم نے بعض اوقات یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک ہی سواری کو اپنے اپنے تانگوں پر بٹھانے کے مسئلہ پر دو تانگے والے آپس میں الجھ پڑتے ہیں اور لڑائی جھگڑے تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ لیکن لطف کی قابلِ غور بات یہ ہے کہ اس لڑائی جھگڑے میں وہ گالیاں ایک دوسرے کو نہیں بلکہ سواری کو دیتے ہیں۔ ایک کہتا ہے "تم ہی اس ..... کو لے جاؤ"۔ دوسرا کہتا ہے: "نہیں اگر تمہارے گھر میں اس کی

ضرورت ہے تو تم لے جاؤ۔ شرم کرو۔ کسی کو بھی نہیں چھوڑتے۔" ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ خدمت خلق کے جذبے سے بھرپور سینکڑوں ہزاروں جماعتوں کی موجودگی بڑی اطمینان بخش ہے وہ اس لیئے کہ عوام کے پاس چوائس کافی ہے وہ جس تانگے پر چاہیں بیٹھ سکتے ہیں۔

موجودہ سیاسی پارٹیوں اور دیگر قومی جماعتوں کی موجودگی اور بزرگوں میں خدمت خلق کے اس جذبے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ ماشاءاللہ گھر گھر میں مستقبل کی قومی جماعتوں کی چھوٹی چھوٹی نرسریاں قائم ہو گئی ہیں۔ ہر گھر میں چھوٹے چھوٹے ممتاز رہنما وجود میں آ چکے ہیں۔ دراصل ملک کی فضا ہی کچھ ایسی رہنما پرور بن گئی ہے کہ اس میں سانس لینے والے خود بخود ہی قومی جذبے سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ ہر بچہ مستقبل کا لیڈر ہے۔ اور اس سے بجا طور پر یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ جوان ہو کر ملکی مسائل حل کرنے میں تن من دھن قربان کر دے گا۔ سال ڈیڑھ سال کے دودھ پیتے مستقبل کے ممتاز رہنما کو دیکھئے۔ اگر آپ اتفاق سے دودھ میں چینی نہیں ڈال سکے تو منہ سے فیڈر ہٹا کر یوں پھینکے گا اور گردن گھمائے بغیر آپ کی طرف یوں دیکھے گا جیسے کہہ رہا ہو۔ اچھا یہ بات ہے تو میں جا رہا ہوں بس جلانے۔ اب آپ لاکھ سمجھائیں کہ مُنے ہم تو اتفاق سے دودھ میں میٹھا نہ ملا سکے ورنہ جہاں تک دودھ میں چینی پینے کا تمہارا بنیادی حق ہے اس سے کون انکار کرتا ہے۔ مُنے میاں پھر آپ کی طرف غصے اور احتجاج بھری نظروں سے دیکھیں گے جیسے کہہ رہے ہوں "اچھا ہم مُنے میاں ہو گئے۔ یعنی ہماری کوئی حیثیت ہی نہیں۔" آٹھ دس سال کے ممتاز رہنماؤں کی اپروچ بالکل الگ ہے۔ وہ آپ کو علم کی مار دیں گے بیٹھے بیٹھے اچانک پوچھیں گے "اچھا انکل یہ تو بتایئے کہ چاند سورج سے کتنا دُور ہے" آپ کہیں گے "بیٹے کوئی زیادہ نہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے قریب ہی ہیں اور پھر یہ اِدھر اُدھر گھومتے بھی تو رہتے ہیں۔" ممتاز رہنما کہے گا "بالکل غلط۔ چاند اور سورج کا درمیانی فاصلہ بے حد طویل اور ناقابلِ عبور ہے۔" اور پھر فخریہ مسکرائے گا۔

آپ خفت مٹانے کے لئے کہیں گے "بیٹا اب ایک دوسرے سے اتنے دُور ہو گئے ہوں گے جب ہم بچے تھے تو اُس وقت تو خاصے قریب تھے" موصوف پھر پوچھیں گے "اچھا بتایئے کہ پاکستان کی کرکٹ ٹیم کے کپتان کتنی ٹیسٹ سینچریاں بنا چکے ہیں"؟ آپ پہلے تو ٹالیں گے پھر اصرار پر کہیں گے "بیٹے اس میں اختلاف ہے۔ دراصل ان چیزوں کا کوئی صحیح ریکارڈ نہیں ہوتا۔ کوئی کہتا ہے چار سینچریاں بنا چکے ہیں اور کوئی کہتا ہے چھ۔ بعض سات آٹھ بھی بتاتے ہیں"۔ موصوف فخریہ کہیں گے "بالکل غلط۔ وہ تو بارہ سینچریاں بنا چکے ہیں"

کالج اور یونیورسٹی جانے والے مستقبل کے ممتاز رہنماؤں کی تو دنیا ہی الگ ہے۔ ان رہنماؤں کو نہ اپنی فکر ہے نہ اپنے تعلیمی معاملات کی۔ بس ایک ہی دھن سر پر سوار ہے اور وہ ہے قومی خدمت کی دھن۔ یہ آپ کو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو کھلے گلوں والے نوجوان نظر آ رہے ہیں سب کے سب مستقبل کے ممتاز رہنما اور سیاستدان ہیں۔ کہتے ہیں لندن میں ایک دولت مند شخص کو اپنے اکلوتے بیٹے کے مستقبل کی فکر تھی وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اپنے بیٹے کو اس کے رجحان کے مطابق تعلیم دلائے تاکہ وہ بڑا ہو کر بڑا آدمی بنے۔ اس سلسلے میں اس نے ایک ماہر نفسیات سے مشورہ کیا جس نے کیس پر غور کرنے کے بعد مشورہ دیا کہ کمرے میں نوٹوں سے بھرا ہوا ایک بٹوہ، ایک بیئر کی بوتل (خیر اب بیئر وغیرہ کا استعمال تو پاکستان میں قانوناً منع ہے) ایک یوڈی کلون کی شیشی اور ایک میز پر بائیبل رکھ دو اور کہیں سے چھپ کر دیکھو۔ اگر تمہارے بیٹے نے بٹوہ اٹھا لیا تو اسے کمرشل تعلیم دلائیں بہت بڑا صنعت کار بنے گا، اگر اس نے بیئر پی لی تو عیاشی کی لائن اختیار کرے گا۔ اگر یوڈی کلون میں دلچسپی لی تو عشق کا پیشہ اختیار کرے گا اور اگر بائیبل کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا تو سمجھ لیں کہ پادری بنے گا۔ دولت مند اور فکرمند باپ نے یہ تجویز مان لی۔ مگر دوسرے دن پہلے سے زیادہ پریشان آیا اور بتایا کہ میں نے آپ کی ہدایات پر عمل کیا اور چھپ کر دیکھا۔ میرا لختِ جگر کمرے میں آیا۔ سب سے پہلے اس نے بٹوہ اٹھایا جیب میں رکھا، پھر

یوڈی کلون اپنے کپڑوں پر چھڑکا۔ اس سے فارغ ہو کر بیئر کی بوتل چڑھا گیا اور چند ہی لمحوں میں بوتل خالی کر دی اور بعد میں بڑی توجہ سے بائیبل کھول کر پڑھنے لگا۔ چنانچہ کچھ پتہ نہ چل سکا کہ برخوردار کا رجحان کیا ہے اور وہ بڑا ہو کر کیا بنے گا؟ ماہر نفسیات نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں بلکہ میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کا بیٹا بڑا ہو کر سیاستدان بنے گا۔

چند دن ہوئے ہم نے سوچا چلو آج اپنے زمانۂ طالب علمی کی یادیں تازہ کرنے کے لئے شہر کے مختلف کالجوں کا چکر لگائیں۔ چنانچہ ہم شہر کی بڑی سڑک کی طرف نکل گئے۔ ایک کالج کے باہر طلبا کا بہت بڑا اجتماع تھا۔ پوچھا۔ بھائی صاحب۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ جواب ملا۔ صاحب ہم چاہتے ہیں کہ چونکہ سارا سال پڑھائی نہیں ہوئی اس لئے امتحان ملتوی کئے جائیں۔ ہم نے کہا امتحانات تو پہلے ہی ملتوی ہو چکے ہیں اپریل کی بجائے ستمبر میں ہوں گے۔ ایک نوجوان نے ہمیں قدرے تلخی سے کہا کہ قبلہ امتحانات میں چار چھ مہینے کا التوا تو ہر سال ہوتا ہے ہم تو چاہتے ہیں کہ اب کی مرتبہ امتحانات اگلے سال مارچ اپریل میں ہوں۔ ایک اور صاحبزادے بولے۔ "پھر ہماری ٹرانسپورٹ کا مسئلہ بھی تو حل نہیں کیا جا رہا۔ پچاس سیٹوں والی بس میں کوئی ساٹھ طالب علم بٹھا دیئے جاتے ہیں ہم کوئی بھیڑ بکریاں تو نہیں۔" ہم وہاں سے چل دیئے۔ دوسرے کالج کے لڑکے بھی کالج کے باہر سڑک پر کھڑے بڑے غصہ کے عالم میں نعرے لگا رہے تھے۔ ہم نے مستقبل کے ایک ممتاز رہنما سے پوچھا کہ آپ حضرات بھی امتحانات ملتوی کرانے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ انہوں نے الٹا ہم سے سوال کیا۔ کیا آپ نے مصر کے صدر کا بیان نہیں پڑھا؟ ہم دنیائے اسلام کا سودا نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اس امریکی سازش کو ناکام بنا دیں گے۔ ہم نے کہا ضرور۔ ضرور۔ اور ادھر جو نگاہ اٹھائی تو دھواں ہی دھواں نظر آیا۔ یہ آنسو گیس کے گولے تھے ہم آنکھوں میں آنسو لئے وہاں سے چل دیئے۔ لیکن دل ہی دل میں خوش بھی تھے کہ مستقبل کے ممتاز رہنما اصل میدان کارزار میں آنے سے پہلے اپنی سیاسی اور عسکری تربیت مکمل کر

رہے ہیں۔ اسی طرح دو تین اور کالجوں کا جو چکر جو ہم نے لگایا تو معلوم ہوا کہ طلبار میں سیاسی شعور بہت بیدار ہو چکا ہے وہ مقامی اور قومی معاملات سے لے کر بعض بین الاقوامی واقعات کے خلاف نعرہ زنی کر رہے تھے۔ طلبار کی ان اعلیٰ صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ دیکھ کر ہم بڑے مسرور گھر کو چل دیئے۔ چونکہ ہم نے جوانی میں بھی طالبات کے کالجوں کے چکر نہ لگائے تھے اس لئے آج بھی ہمارا ان کی طرف جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن حسنِ اتفاق دیکھئے کہ جونہی ہم واپس آ رہے تھے مختلف کالجوں کی طالبات کا ایک جلوس ہمیں اپنی طرف آتا دکھائی دیا" ہائے۔ ہائے" کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہم نے سوچا کہ آج مارے گئے یہ ان کو کیسے معلوم ہو گیا کہ ہم ان کو نظر انداز کر کے واپس جا رہے تھے اور ان کے کالجوں کی طرف جانے کا ارادہ نہ رکھتے تھے۔ آوازیں آنے لگیں " ماریں گے مر جائیں گے ...... کا سر جھکائیں گے" ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہی محسوس ہوا جیسے بھری ہوئی لڑکیاں کہہ رہی ہوں " ماریں گے مر جائیں گے زاہد کا سر جھکائیں گے" زاہد کا سر تو آج صبح ہی سے جھکا ہوا ہے۔ ہم نے آج صبح اپنی قوم کے مستقبل کو دیکھا ہے آپ کیا سر جھکائیں گی ہمارا۔ لیکن ہم نے فیصلہ کیا کہ اگر جلوس کی ترجمان نے ہم سے پوچھا کہ یا حضرت آپ جو یونہی ہمیں نظر انداز کر کے واپس جا رہے تھے اس کی وجہ ؟ تو ہم کہہ دیں گے کہ ہم تو آپ ہی کی طرف جا رہے تھے لیکن ذرا اوپر سے ہو کر آ رہے تھے کہ راستہ میں ملاقات ہو گئی۔ چلو اب آپ کے ساتھ چلتے ہیں پہلے کون سے کالج فار ویمن میں جانا ہے ؟ اتنے میں جلوس ہمارے قریب پہنچ گیا اب نعروں کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔ ہمارے سب خدشات دور ہو گئے۔ طالبات کہہ رہی تھیں" رہا کرو رہا کرو ناصر کو رہا کرو" " نہیں چلے گا۔ نہیں چلے گا۔ مولوی راج نہیں چلے گا" ....

تو ہم کہہ یہ رہے تھے کہ گھر گھر میں مستقبل کے ممتاز رہنماؤں کی نرسریاں تیار ہو رہی ہیں لہٰذا پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ہمیں ہر سال قومی رہنماؤں کی کھیپ

ملتی رہے گی مستقبل کے ممتاز رہنما موجودہ ممتاز رہنماؤں سے بہت کچھ سیکھ رہے ہیں۔ کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ یہ محاورہ ہم نے سکول میں اپنی آٹھویں جماعت کی اردو کی مشہور کتاب "کاروانِ ادب" میں پڑھا تھا (اس زمانہ میں آٹھویں جماعت کی اردو کی ہمیشہ یہی کتاب ہوتی تھی اب تو ہم اتنی ترقی کر گئے ہیں کہ ہر سال ہر کلاس کے لئے الگ اور مختلف کتاب ہوتی ہے)۔ اب بڑھاپے میں ہمیں اس محاورے کی صداقت اور گہرائی کی سمجھ آئی ہے۔ بچپن واقعی بچپن ہی ہوتا ہے سکول میں ہم نے یہ محاورہ پڑھا تو تحقیق وجستجو کے خداداد جذبہ سے مجبور ہو کر کھیتوں کی طرف چل پڑے۔ مئی جون کے دن تھے۔ خربوزے اپنے جوبن پر تھے۔ ہم گھنٹوں کھیت کے کنارے بیٹھے رہے اور آس پاس لگی خربوزوں کی دو بیلوں کے خربوزوں کو گھنٹوں دیکھتے رہے۔ خربوزوں کے یوں معائنہ کا یہ عمل ہم مسلسل کوئی پانچ چھ دن کرتے رہے کہ دیکھیں پہلے کون سا خربوزہ کس کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے۔ ایک دن ہمیں معلوم ہوا کہ خربوزوں نے تو کوئی رنگ ڈھنگ نہیں پکڑا، البتہ ہمارا اپنا رنگ مسلسل گرمی اور لُو لگنے سے خربوزی یعنی خربوزہ جیسا ہو گیا ہے اور اگر ہم دونوں ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر چہرے پر رکھتے تو چہرے پر خربوزے ہی کی طرح دس کاشوں کے نشان پڑ جاتے اور بالآخر ہماری حالت یہ ہو گئی کہ :۔

انتہائے لاغری سے جب نظر نہ آیا میں
ہنس کے وہ کہنے لگے بستر کو جھاڑا چاہیئے

سو یہ بچپن کے دن تھے اور ہم محاورات کی سچائی کو ان کے لفظی معنوں سے جانچنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اب ہم محاورات کی روح دیکھتے ہیں۔ اسی طرح "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" کہ اصل معنی ہم اب سمجھے ہیں بلکہ خود مستقبل کے سیاسی خربوزوں کو رنگ پکڑتے دیکھ رہے ہیں۔

ہم اپنے قومی رہنماؤں اور سیاسی پارٹیوں کے اعلیٰ عہدیداروں کے متعلق جو یہ کہتے

رہتے ہیں کہ وہ جذبۂ خدمت خلق سے سرشار رہتے ہیں اس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ جونہی ان کی طبیعت ذرا سی ناساز ہوتی ہے فوراً لندن کا رخ کرتے ہیں ۔مقصد یہ ہوتا ہے کہ جلد از جلد صحت یاب ہو کر پھر قوم کی خدمت میں مگن ہو جائیں ۔ اگر خدانخواستہ کسی بھی رہنما کی طبیعت ناساز ہو جائے اور ناساز ہی رہے تو نقصان کس کا ہے ؟ ظاہر ہے قوم ہی کا ہوگا ۔اس لئے وسیع قومی مفاد کی خاطر ان بچاروں کو ملک سے باہر جانا پڑتا ہے ۔ہر روز کسی نہ کسی ممتاز رہنما کو مجبوراً آنکھ، کان، دانت یا گلے وغیرہ کے علاج کے لئے مجبوراً باہر جانا پڑتا ہے ۔قوم کی خاطر ۔ لیکن کچھ عاقبت نااندیش کہتے ہیں قبلہ یہاں قوم ہی کو آنکھیں دکھالو ۔ باہر کیوں جاتے ہو ۔بعض مخالفین یہ بھی کہتے ہیں کہ فلاں رہنما دراصل "لندن پلان" بنانے کے لئے لندن جا رہے ہیں اور اس لندن پلان کا مقصد ملک کو مزید توڑنا پھوڑنا ہوگا لیکن مخالفین کے اس طرح کے بے جا الزامات ہمارے رہنماؤں کو خدمت خلق سے نہیں روک سکتے ۔جب خود صحت مند نہ ہوں گے تو قوم کی حالت کا کیا خاک خیال رکھیں گے ۔

ویسے ممتاز رہنماؤں کی لندن یاترا اس لئے بھی ضروری ہے کہ اُدھر لندن ہی میں اعصابی امراض کے ممتاز برطانوی ڈاکٹر ولیم گوڈی نے سیاستدانوں اور لیڈروں کو دماغی صحت کا معائنہ کرانے کا مشورہ دیا ہے ۔ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ لیڈر حضرات پر لاکھوں کروڑوں افراد کے جان و مال کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے ۔اگر ان کے دماغ کا "پیچ" ڈھیلا ہو جائے تو انتہائی خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں ۔ برطانوی دارالعوام کے ممبروں کو مہینے کے مہینے دماغی معائنہ کا مشورہ دیا گیا ہے اور وہ بھی کمپیوٹر کے ذریعے ۔ڈاکٹر گوڈی نے اپنے طور پر ان لوگوں کی فہرست تیار کی ہے جو دماغی مریض ہو سکتے ہیں ۔اس فہرست میں کابینہ کے ممبر سب سے اوپر ہیں ۔ برطانوی ڈاکٹر نے جن رہنماؤں کا ایک آدھ پیچ ڈھیلا ہو جائے ان کے لئے ماہانہ چیک اپ تجویز کیا ہے ۔لیکن بزرگو سوال یہ ہے کہ جن رہنماؤں کا پورا انجر پنجر ہی ڈھیلا ہو ان کے بارے میں کیا ارشاد ہے ؟ ۔

ممتاز رہناؤں کی علاج کے لئے لندن یاترا کا ذکر تو ہم نے ایسے ہی ضمنی طور پر کر دیا۔ ہم دراصل یہ بتا رہے تھے کہ ہماری قوم کے عروج کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ یہاں ہر شخص عوام کی فلاح و بہبود کے مقدّس جذبے سے سرشار نظر آتا ہے اور اسی لئے یہاں ہزاروں جماعتیں بمعہ اپنی شاخوں کے ملک بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ہم نے دیکھا ہے کہ ایک اور لحاظ سے بھی یہ نام نہاد ترقی یافتہ ممالک ہم سے بہت پیچھے ہیں لیکن وہ پراپیگنڈہ کے زور سے ہم کو ترقی پذیر اور خود کو ترقی یافتہ ظاہر کرتے ہیں۔ اُن میں اس قدر یک رنگی ہے کہ مثلاً کسی امریکی سے پوچھو۔ آپ کی تعریف؟ وہ کہے گا "میں امریکی ہوں"۔ لیکن ہمارے ہاں ایک منفرد اور روح پرور رنگا رنگی ہے۔ یک رنگی سراسر بوریت ہے جبکہ رنگا رنگی میں ہی زندگی کی دلچسپیاں پنہاں ہیں۔ مثلاً اپنے ہاں کسی سے پوچھیے۔ معاف کیجئے۔ آپ کون صاحب ہیں؟ وہ صاحب کہیں گے "میں پنجابی ہوں" دوسرے سے یہی سوال کیجئے۔ "بھائی صاحب۔ آپ کی تعریف"؟ موصوف کہیں گے "خو۔ ہم پٹھان ہے"۔ اچھا اچھا بہت شکریہ۔ پھر تیسرے صاحب سے یہی سوال کیجئے وہ فرمائیں گے۔ "سائیں۔ ہم تو سندھی ہیں"۔ "اور صاحب آپ؟"۔ "ہم خالص بلوچی ہیں"۔ ماشاءاللہ۔ اور صاحب آپ کی تعریف کیا ہے؟" "میں سُنی ہوں"۔ شکریہ۔ اور وہ صاحب جو ذرا دور کھڑے ہیں ان کی تعریف کیا ہے؟" "وہ شیعہ ہیں"۔ بہت خوب۔ اچھا براہ کرم ذرا یہ بھی بتا دیجئے کہ وہ صاحب جو دور سے آرہے ہیں وہ کون صاحب ہیں؟" "وہ تو بائیں بازو سے تعلق رکھتے ہیں"۔ "اور ان کے پیچھے"؟ "ان کا تعلق دائیں بازو سے ہے"۔ واہ واہ۔ کیا رنگا رنگی ہے۔ گو ہم مطمئن ہیں کہ ہماری قوم میں عروج کے تمام آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہم کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ کہیں مورّخ نے ہمارے زوال کے اسباب لکھنے شروع تو نہیں کر دیئے؟۔

عاشقوں سے برادرانہ اپیل

ہمارا ذاتی خیال تھا کہ عاشق حضرات دنیا کی واحد ایسی کمیونٹی ہے جس میں ایثار، قربانی اور صبر کا صبر آزما جذبہ دوسری تمام برادریوں سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک عاشق ہونے کا مطلب ہی یہی ہے کہ برخوردار مر مر کے جینے، جی جی کے مرنے اور فلسفۂ عدم تشدّد کا پیروکار ہے۔ عاشقوں کے متعلق ہماری یہ ناقص رائے دراصل وہ قصے کہانیاں اور عشقیہ شعر ہیں جو ہم بچپن سے سنتے اور پڑھتے آئے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں ہمارے سکول کے ایک دوست نے ایک دن ہمیں اعتماد میں لے کر بڑے رازدارانہ لہجہ میں بتایا تھا کہ کل شام جب اس کی محبوبہ اس کے مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی تو اس نے اپنے مکان کی چھت سے خوشبو کی ایک بھری ہوئی شیشی محبوبہ پہ انڈیل دی۔ اب ہمیں یاد نہیں کہ خوشبو کی وہ شیشی میڈ ورا آف لندن کی تھی یا کسی اور برانڈ کی۔ لیکن جو بات عشق کی اس معصوم مثال سے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں وہ ہے جذبۂ عشق۔ یعنی موصوف نہ جانے کب سے چھت پر کھڑے ہیں۔ ایک ہاتھ میں خوشبو کی شیشی ہے اور دوسرا ہاتھ شیشی کے کارک پر ہے کہ جونہی بچی ادھر سے گزرے

پوری کی پوری شیشی خالی کر دی جائے۔ سکول اور کالج کی زندگی میں اس طرح کے اور بہت سے سچے واقعات ہمارے علم میں لائے جاتے تھے۔ سنگدلی کی مرتکب ہونے والی محبوباؤں کو قدموں میں لانے کے لئے چلّے کاٹنے اور تعویذ ٹونے وغیرہ کرانے کے قصے بھی ہمیں بتائے جاتے تھے اور سچی بات یہ ہے کہ ہم خود بھی عشق میں کچھ دینے کے نہ کہ لینے کے قائل ہیں لیکن آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں کہ اس نئے دَور میں دنیا کی ہر بدلی بدلی چیز کی طرح عاشق حضرات بھی بدل گئے ہیں۔ انہوں نے اس مشینی دور میں مادہ پرست (یہاں مادہ سے مراد مونث، عورت ذات یا استری نہیں) سوچ اپنالی ہے۔ پہلے عاشق صبر و تحمل سے کام لیتا تھا۔ اپنے امیر مینائی نے کہا تھا:۔

کوئی میرے برابر کیا کرے گا ضبطِ الفت کو
نہیں آتا زباں تک میری حرفِ آرزو برسوں

اسی طرح ایک نامعلوم شاعر نے ایک دفعہ کہا تھا:۔

ستم کے جو تم عادی ہو تو ہم بھی خوگرِ غم ہیں
جفائیں جتنی ہوں تھوڑی، ستم جتنے ہوں سو کم ہیں

پرانے زمانہ میں عاشق حضرات کسی میلے ٹھیلے، مشاعرے یا شادی بیاہ کی کسی تقریب میں کسی کو اتفاقیہ دل دے بیٹھتے تھے اور پھر ساری زندگی اس آس میں بیٹھے رہتے تھے کہ شاید کہیں کسی طرح جانِ آرزو سے دوبارہ ملاقات ہو جائے۔ شاعر یاس، یاس عدم آبادی فرماتے ہیں۔

دھوم سنتا رہا اب آتے ہیں اب آتے ہیں
حشر تک میں یونہی کھولے ہوئے آغوش رہا

خیر ہم یہ تو نہیں مانتے کہ یاسؔ صاحب دن رات آغوش کھولے بیٹھے رہتے ہوں گے۔ ظاہر ہے آغوش کھولنے اور بند کرنے کے علاوہ کوئی اور کام بھی کرتے

ہوں گے لیکن چونکہ ہمارے پاس ان کے بیان پر شک کرنے کی کوئی ٹھوس وجوہات نہیں اس لئے ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ موصوف اکثر اوقات آغوش کھول کر ہی رکھتے ہوں گے۔ اُدھر مومن صاحب ساری زندگی اپنی محبوبہ کی شکل ہی نہ دیکھ سکے۔ چنانچہ وہ اپنی بے وقت وفات کے بعد کہتے ہیں :-

موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر
جو نہ دیکھا تھا تماشہ عمر بھر دکھلا دیا

جبکہ آج کل ہم محسوس کر رہے ہیں کہ عاشق ضبط و تحمّل کا دامن چھوڑ کر اور محض کل کے وعدوں اور وصل کی موہوم امیدوں پر جینے کی بجائے اس محبوب کو جان سے مار دیں گے جو ان سے عملی تعاون نہ کرے۔ ہمارے نزدیک عاشقوں نے یہ Do or die کا جو خوفناک روّیہ اختیار کر لیا ہے وہ محبوباؤں کے لئے بڑا خطرناک ہے۔ آخر عاشق اور شرپسند میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے۔ عاشقوں کے روّیہ میں اس ڈرامائی اور انقلابی تبدیلی کا احساس ہمیں آج کے مقبول فلمی گانے اور دوگانے سن کر ہوا ہے جو ہم اکثر ریڈیو پاکستان سے سنتے رہتے ہیں۔ آج کے اکثر فلمی گانوں میں ہیرو یا عاشق بات بات پر مرنے مارنے اور محبوبہ کو موت کے گھاٹ اتار دینے پر آمادہ نظر آتا ہے۔ ان گانوں کے عکس میں ہم نے عاشقوں کی مجموعی صورت حال کا عکس دیکھ لیا ہے۔ مثلاً ایک مقبول گانے کے بول یوں ہیں :-

محبت کی ایسی قسم آج کھائیں
ہمیں موت آئے اگر بھول جائیں

ایک دوگانا یوں ہے۔

لڑکا : پیار کا وعدہ ایسے نبھائیں
میں بھولوں تو میں مرجاؤں

تو بھولے تو تو مرجائے

لڑکی : جس دن تیری یاد نہ آئے
اس دن مجھ کو موت آ جائے

اب سچی بات یہ ہے کہ ہم موت اور مرنے مارنے کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ بھائی آپ حضرات قومی اسمبلی میں حزب اقتدار اور حزب اختلاف تو نہیں کہ یوں ایک دوسرے سے جنگ کریں اور "نہ کھیلیں گے نہ کھیلنے دیں گے" کی منفی سیاست کو اپنالیں۔ مندرجہ بالا گانے میں لڑکے کا کہنا کہ "میں بھولوں تو میں مرجاؤں تو بھولے تو تو مرجائے" ایک انتہائی کاروباری اور جارحانہ روّیہ ہے۔ میاں عاشق صاحب یوں کیوں نہیں کہتے کہ بی بی۔ مَیں اگر تمہیں بھول گیا تو پھر مَیں مَیں نہ رہوں گا اور میری موت واقع ہو جائے گی اور اگر تم ہی مجھے بھول گئی تو پھر میں ویسے ہی زندہ نہ رہ سکوں گا۔ مقصد یہ کہ دونوں صورتوں میں مَیں ہی مروں گا۔ اب یہ شاعروں کا کام ہے کہ ہمارے اس نثرانہ جذبے کا اظہار غزلانہ انداز میں کریں۔ آخر عاشق اپنے آبا ؤ اجداد یعنی مجنوں، رانجھا، فرہاد وغیرہ کو کیوں بھولتے جا رہے ہیں اور ان کی سنت پر کیوں عمل پیرا نہیں ہوتے۔

ہمارے زمانے میں محبوب اگر مل بھی جاتا تھا اور بے پردہ سامنے آبھی جاتا تھا تو اس کا یہ مطلب نہ ہوتا تھا کہ وہ سنگدل عملی تعاون کے لئے بھی تیار ہو گیا ہے۔ وہ مسلسل نہ نہ ہی کرتا رہتا تھا۔ لیکن عاشق پھر بھی انتقامی کارروائی نہ کرتا تھا صرف خاموش احتجاج ہی پہ اکتفا کرتا تھا۔ اپنے حضرت داغ پھر کہتے ہیں :-

اس نہیں کا کوئی علاج نہیں
روز کہتے ہیں آج نہیں

ہو سکتا ہے بی بی نے یہ محاورہ نہ سنا ہو کہ "آج کا کام کل پہ نہ ڈالو" اس لئے وہ داغ صاحب کو یہی سمجھاتی ہو گی کہ نہیں کل۔ اب یہ ہمارے علم میں نہیں ورنہ

ہم ضرور قارئین کو اعتماد میں لیتے کہ ہر روز کل کے لئے کیوں کہتی تھی۔ ممکن ہے روزانہ ہی موسم خراب ہوتا ہوگا۔ شاید شدید گرمی ہوتی ہوگی۔ یا ممکن ہے ویسے ہی ان دنوں اس کی طبیعت ٹھیک نہ ہوتی ہو۔ بہر حال مسلسل انکار کی وجہ کے متعلق شاعر بھی خاموش ہے اور مورخین نے بھی اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈالی۔ اس ہجر گزیدہ شاعر کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں۔

مانگتا ہوں جو دعا وصل کی ان کے آگے
چپکے چپکے وہ یہ کہتے ہیں کہ ممکن ہی نہیں

اب خود حضرت اکبر الہ آبادی جیسے بزرگ شاعروں کو ہی دیکھ لیں۔ موصوف کی پیرالیم Problem تھی کہ:۔

یہ نہیں کہتے یہیں رہ جاؤ اب تم رات کو
بس ان ہی باتوں سے اکبر میرا جل جاتا ہے دل

اس شعر میں لفظ "رات" پر بڑا زور ہے۔ ہم تفصیل میں نہیں جاتے کہ اس لفظ پہ کیوں اور کس لئے زور ہے لیکن ہم صرف واضح یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اکبر صاحب کا بھی بس دل ہی جل جاتا تھا وہ یہ نہیں فرماتے کہ اگر تم ہمیں رات کو اکموڈیٹ نہیں کر سکتی تو ہم کسی وقت تمہیں دن ہی کو اکموڈیٹ کر دیں گے۔ ادھر صفدر رام پوری کا معاملہ ہی الگ ہے۔ ان کی محبوبہ رات کو کمپنی دینا تو چاہتی ہے لیکن اسے اعتبار نہیں۔

میں نے جو کہا ان سے کہ شب کو یہیں رہو
آنکھیں جھکا کے بولے کہ کس اعتبار پہ

آنکھیں جھکانا ظاہر ہے نیم رضامندی سی کی کیفیت ہے۔ لیکن بالآخر انہوں نے وہاں شب گزاری یا نہیں۔ اس کے متعلق ہمیں کچھ علم نہیں اور نہ ہی ہمیں لوگوں کے ایسے نجی معاملات میں دلچسپی لینے کی عادت ہے۔ اب آپ چند منٹوں کے لئے زمانہ حال میں آجائیں اور ایک اور فلمی گانے میں ہیرو ہیروئن کے خطرناک ارادے دیکھئے۔

نیل گگن تلے ہم نے یہ وعدے کئے
تیرے بن میں نہ جیوں میرے بن تو نہ جئے

یعنی وہی دو اور دو چار والی بات۔ قبلہ عاشق صاحب۔ براہ کرم صورت حال کا از سرِ نو جائزہ لیں۔ یہ آپ میں ہلاکو اور چنگیز خاں کی روح کہاں سے سرایت کر گئی۔ ٹھیک ہے اگر آپ اپنی محبوبہ بن نہیں جی سکتے تو یہ کیوں توقع رکھتے ہیں کہ موصوفہ بھی بن آپ کے نہیں جئے گی بلکہ ممکن ہے کہ وہ آپ کی روانگی کے بعد ہی جی بھر کر جی سکے۔ اس لئے یہ اینٹی ہیروئن روّیہ چھوڑ دیں، صراطِ مستقیم اختیار کریں۔ اشارے کنائے میں بات کر لیا کریں اور بات بات میں قاچو (چاقو) کا بے دریغ استعمال امن عامہ کے وسیع مفاد میں بند کر دیں۔

ہم نے اپنے ایک مضمون "اسبابِ زوالِ امت" میں ثابت کیا ہے کہ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ یہاں اس مضمون کا حوالہ ہم اس لئے دے رہے ہیں کہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ ہیرو یا عاشق کی حرکات یا عشق کے متعلق مجموعی اپروچ سے ہیروئن یا محبوبہ بھی خاصی متاثر نظر آتی ہے۔ یعنی خربوزے کو دیکھ کر خربوزی بھی رنگ پکڑ رہی ہے وہ بھی بعض اوقات سزائے موت وغیرہ سے کم سزا دینے کے حق میں نظر نہیں آتی بلکہ خود اپنے لئے بھی اپنی چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر سزائے موت تجویز کر لیتی ہے۔ مثلاً اس کا یہ کہنا :-

جس دن تیری یاد نہ آئے
اس دن مجھ کو موت آ جائے

اب ہمارا کہنا یہ ہے کہ انسان کی آج کی زندگی بہت مصروف ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کام کے رش کی وجہ سے دوسرا فریق ایک دو دن یاد نہ آ سکے یا آپ کو کوئی ایسی اسائنمنٹ دے دی گئی ہو کہ آپ ہزار کوشش اور خواہش کے باوجود اپنے چاہنے والے کو یاد نہ رکھ سکیں اور پورے خلوص اور ایمانداری سے یہ سمجھتی ہوں کہ جونہی اس کام سے

فارغ ہوئی عاشق صاحب سے رابطہ قائم کروں گی۔ اس لئے ہماری ناقص رائے میں یہ جو یہاں یاد نہ آنے کی مدت مقرر کی گئی ہے یعنی "جس دن" مطلب یہ کہ اگر چوبیس گھنٹوں میں فریقِ ثانی کی اتفاقاً یاد نہ آئے تو موت آ جائے یہ مدت بڑھا دینی چاہیے۔ مثلاً ہماری رائے میں یہ مدت ایک ہفتہ تک بڑھائی جا سکتی ہے ویسے بھی اللہ تعالیٰ نے جو یہ سات دن بنائے ہیں اس کی کوئی مصلحت تو ضرور ہو گی۔ لہٰذا ہمارے خیال میں اگر سات دن تک بھی اُس کی یاد نہ آئے تو پھر بھولنے والے یا والی کو اتفاق رائے سے سزا کا مستحق قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ہم اس صورت میں بھی سزائے موت کے حق میں نہیں ہیں۔ یہ سزا کم سے کم ہونی چاہیئے تاکہ ملزم یا ملزمہ کو اصلاح کا چانس مل سکے اور وہ سُدھر کر راہ راست پر آ سکے لیکن اگر اسے فوراً ہی تارا مسیح کے حوالے کر دیا گیا تو پھر تو یہ ایک انتقامی کارروائی ہو گی اصلاحی کارروائی تو نہ ہوئی۔ لہٰذا ہمارے خیال میں یہ شعر یوں بھی ہو سکتا ہے :۔

جس دن تیری یاد نہ آئے
اُس دن مجھ کو موشح آ جائے

یعنی سزاؤں کا مقصد اگر اصلاحی ہے تو محبوبہ کو موشح آ جانے سے بھی اصلاح ہو سکتی ہے۔ مقصد تو اس کو یاد دہانی کرانا ہے کہ محترمہ آج آپ اپنے ان کو بھول گئی ہیں ظاہر ہے جب اسے موشح آئے گی تو وہ فوراً اپنے عاشق کی طرف رجوع کرے گی اور بات آگے نہ بڑھ سکے گی۔ ہاں اگر محبوبہ مسلسل بھول جانے کی عادی ہو جائے اور وہ ہر روز ہی بھول جایا کرے تو پھر سزا میں قدرے اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر شاعر کا اصرار ہو کہ مذکورہ شعر میں لفظ موشح سے شعر کا وزن بگڑ جائے گا اور یہاں لفظ "موت" ہی موزوں ترین ہے تو پھر یوں کیا جا سکتا ہے کہ ہیرو یا ہیروئن کو موت سے بچانے کے لئے لفظ موت کے حرف م پر پیش ڈال دی جائے یعنی "مُوت"۔ اب گانے کے

بول یوں ہوں گے۔

جس دن تیری یاد نہ آئے
اُس دن مجھ کو مُوت آجائے

اس شعر کے دوسرے مصرع میں "مُوت آجائے" میں یہ معنی پنہاں ہیں کہ بار بار مُوت آتا رہے۔کیونکہ نارمل مُوت سے تو یاد دہانی کا کام نہ لیا جاسکے گا۔اب اگر محبوبہ کو دن میں بار بار مثلاً سوڈیڑھ سو دفعہ مُوت آتا رہا تو ظاہر ہے باتھ روم میں عاشق صاحب کی یاد آہی جائے گی۔لیکن اگر کوئی شاعر صاحب یہاں مُوت سے بھی بہتر لفظ اور سزا تجویز کر سکیں تو ہمیں مطلع فرمائیں تاکہ ہم اسے عام کر سکیں۔لیکن ہم ذاتی طور پہ یہ لفظ مَوت کے ہر صورت میں خلاف ہیں۔جیسا کہ ہم نے پہلے بھی اشارہ کیا ہے۔محبوب ساری ساری زندگی بے وفائی کرتے رہتے تھے لیکن عاشق حضرات پھر بھی مرنے مارنے پہ تیار نہ ہوتے تھے۔ آپ نے حضرت داغ کے محبوب کا ذکر سن ہی لیا ہے کہ وہ بالآخر داغ صاحب کی موت پہ تشریف لے ہی آئے تھے لیکن حضرت ذوق کی بدقسمتی ملاحظہ فرمائیں۔

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں
بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

آپ نے ذوق صاحب کی وسیع القلبی ملاحظہ فرمائی۔محبوبہ کا یہ رویہ ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ مرحوم شاعر کی باڈی کو جلد از جلد ڈسپوز آف کر دیا جائے تاکہ وہ مکمل فری ہو کر کوئی نیا اتحاد بنا سکے۔لیکن شاعر پھر بھی اس سنگدل کو زیادہ سے زیادہ "بے وفا" کہہ رہا ہے۔آج کا عاشق ہوتا تو کہتا " اچھا بی بی۔اب میں تو مر رہا ہوں خدا کرے تم بھی مر جاؤ بلکہ تمہارے اگلے پچھلے بھی مر جائیں تاکہ تم لوگوں کو نصیحت ہو کہ دوسروں کو خراب کرنے کا کیا حشر ہوتا ہے" ہوسکتا ہے کہ محبوبہ کے نابالغ بہن بھائی اور ہمسائے بھی عاشق کی بد دعا کی زد میں آ جائیں۔بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ

اگر آج کے عاشق کو مرنے کے وقت کا پہلے علم ہو جائے یا مرنے سے پہلے چند منٹ کی مہلت مل جائے تو وہ مٹی کے تیل کا ایک ٹین لے کر سیدھا محبوبہ کے گھر پہنچے اور اس کے مکان پر تیل چھڑک کر آگ لگا دے اور جوں جوں آگ کے شعلے اور محبوبہ کی چیخیں بلند ہوں توں توں عاشق کے پاگلوں جیسے قہقہے بھی بلند ہوں۔ ادھر ہمارے پرانے زمانے کے ایک اور عاشق جب عمر بھر محبوبہ کا انتظار کرتے کرتے قریب المرگ ہو جاتے ہیں تو اتفاق سے محبوب بھی ان کو دیکھنے آجاتا ہے۔ دیکھئے شاعر کس شریفانہ انداز میں گلہ کرتا ہے۔

نزع کے وقت دیکھنے آئے
جائیے آپ سے خفا ہیں ہم

لیکن آج کے فلمی گانوں کی روشنی میں ہم محسوس کرتے ہیں کہ اگر موجودہ دور کا کوئی عاشق یا ہیرو نزع کے عالم میں ہوتا اور کسی ہسپتال میں بستر مرگ پہ پڑا ہوتا اور ہیروئن بیمار پرسی کے لئے آجاتی تو ہماری فلموں میں یہ سین کچھ اس طرح ہوگا۔ ہیرو بستر مرگ پر لیٹا ہوا ہے۔ بیڈ کے ایک طرف اس کی پریشان حال ماں کھڑی ہے۔ نرس مریض کو دوائی وغیرہ دے کر کمرے سے باہر جا رہی ہے کہ ہیروئن کمرے میں داخل ہوتی ہے۔ کیمرہ ہیرو کے داڑھی بڑھے چہرے کا کلوز اپ دکھاتا ہے۔ ہیرو چہرے پر غصے اور نفرت کے تاثرات لئے ہوئے بڑی تیزی سے اپنا منہ دوسری طرف پلٹ لیتا ہے اور بلند آواز میں کہتا ہے "ماں! یہ میری قاتل ہے۔ اس نے ہماری غربت کا مذاق اڑایا ہے۔ اسے کہو یہاں سے چلی جائے"۔ ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیتی ہے اور کمرے سے باہر چلی جاتی ہے۔

ہمارے پرانے زمانے میں تو محبوب اگر رقیب روسیاہ کے پاس چلا جاتا تو عاشق جذبہ رقابت کے تحت رقیب کو تو برا بھلا کہتا لیکن محبوب کو پھر بھی جان سے مار دینے

کی دھمکی نہ دیتا۔ ملاحظہ فرمایئے کہ ہمارے زمانے میں عاشق رقیب کو بھی کس طرح شرافت کے دائرے میں رہ کر بُرا بھلا کہتے تھے۔

رقیب روسیاہ بیٹھا ہے اس گل رو کے پہلو میں
خدا کی شان ہے پھول میں کانٹا ہو ہی جاتا ہے

یا

روسیاہ رقیب تو ڈر میری آہ سے
بجلی کو لاگ ہوتی ہے رنگِ سیاہ سے

ایک شاعر تو رقیب روسیاہ کو بھی دعا دیتا ہے۔

تم سلامت رہو گھر غیر کا آباد رہے
تم کو کیا شاد رہے یا کوئی ناشاد رہے

ہم اس موضوع پر اور بھی تفصیل میں جا سکتے ہیں لیکن عقلمند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد صرف عاشقوں کو شیشہ دکھلانا تھا جس میں وہ ہمارے زمانے کے عاشقوں کے حوالے سے اپنا چہرہ دیکھ سکیں۔ بہرحال عاشق حضرات کو ہمارا یہی مشورہ ہے کہ براہ کرم "کچھ لو اور کچھ دو" کے سنہری اصول پر عمل کریں اور یہ یک طرفہ ہر وقت لینے ہی لینے کا خود غرضانہ رویّہ ترک کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قتل و غارتگری کا بازار مزید گرم نہ کریں بلکہ اسے آہستہ آہستہ ٹھنڈا کریں اور خود بھی ٹھنڈے ہو جائیں ہم سب کو کوئی نہ کوئی قیمتی مشورہ دیتے رہتے ہیں سو آپ کو بھی ہم نے چند ضروری ہدایات دے دی ہیں اب ان مشوروں پر عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا اپنا کام ہے۔ دوسرے ہم نے محبوباؤں کے حق میں جو آواز اٹھائی ہے اور خونخوار عاشقوں سے ان کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے انہیں یعنی عاشقوں کو اپنے انداز میں جو ڈانٹ ڈپٹ کی ہے اس کا ہمیں کوئی صلہ نہیں چاہیئے۔ ہم اس طرح کے تمام مشورے فی سبیل اللہ دیتے ہیں

لیکن ہمیں علم ہے کہ بعض نرم دل محبوبائیں پھر بھی چاہیں گی کہ ان کی فلاح وبہبود کی خاطر اور ان کا امیج بہتر کرنے کے لئے ہم نے ان کے حق میں جو کلمۂ حق بلند کیا ہے اس پر وہ خوش ہو کر ہمیں کوئی مخصوص انعام و کرام ضرور دیں۔۔۔۔۔۔ ہم پھر کہیں گے کہ ان تکلّفات کی کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن پھر بھی اگر ان کا مسلسل اصرار ہو تو وہ ٹیلیفون ڈائرکٹری سے ہمارا فون نمبر دیکھ کر ہم سے رابطہ پیدا کریں لیکن باری باری۔

نثریہ

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ اسلام نے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے لیکن سوال تو یہ ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو کیا دیا؟ ہم کہتے ہیں آخر یہ بچارے اسلام کو دے ہی کیا سکتے ہیں۔ گنجے نہائیں گے کیا نچوڑیں گے کیا۔ اسلام تو ایک آسمانی سلسلہ ہے۔ یہ تھُڑدِلے تو اردو زبان کو بھی کچھ نہ دے سکے۔ بس اس مفروضہ کی آڑ لے کر کہ اُردو کا دامن بڑا وسیع ہے اور اس میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود ہے (جیسے یہ زبانوں کی سیاہی چُوس ہے) اُردو میں دھڑا دھڑ فارسی اور عربی الفاظ داخل کرتے رہے۔ متقدمین محض عربی اور فارسی سے اُردو کا دامن بقول ان کے وسیع کرتے رہے۔ لیکن ہماری نظر میں وہ اردو کی جھولی میں چھید کرتے رہے۔ ہمارے خیال میں ایک زبان میں دوسری زبان کے الفاظ ملانا زبان میں ملاوٹ کرنا تو کہلا سکتا ہے اور کچھ نہیں۔ متقدمین اُردو میں عربی فارسی سنسکرت وغیرہ داخل کرتے رہے اور حاضرین یعنی زمانہ حاضر کے ادیب اور زبان دان اس میں انگریزی

کی آمیزش کر رہے ہیں۔ حاضرین کا بھی یہ کہنا ہے کہ اُردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ جذب کرنے کا بڑا حوصلہ ہے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ اُردو دانی کا دعویٰ تب کیا جا سکتا ہے جب انسان گھنٹوں گفتگو کرے اور انگریزی کا ایک لفظ بھی نہ بولے۔ خود ہمارا اپنا یہ حال ہے اور اُردو سے دِلی محبت کی یہ کیفیت ہے کہ کسی سے کتنی ہی مشکل سچوالیشن پر بات کریں ایک لفظ بھی انگریزی کا استعمال نہ کریں گے۔ پچھلے دِنوں ہم نے کئی دوستوں کو امریکی سکائی لیب کے ہماری زمین پر گرنے کی وجوہات پر لیکچر دیا اور بتایا کہ سکائی لیب اپنے آربٹ سے کس طرح اور کیوں کر ہٹ گئی لیکن اس ساری ڈسکشن میں ہم نے انگریزی کا ایک لفظ بھی استعمال نہ کیا۔ اِدھر زمانہ حاضر کے ادیبوں کو دیکھیں صرف دو چار منٹ کی گفتگو میں ایکسپوز ہو جائیں گے کوئی کہے گا مجھے تو ڈوبتے سورج کے منظر سے بڑی انسی پی ریشن Inspiration ملتی ہے۔ دوسرے صاحب بولیں گے۔ انتظار حسین کا نیا افسانہ ایک بہت ہی مشکل سبجیکٹ پر لکھنے کی کامیاب کوشش ہے۔ ہمارا دل اس طرح کی انگریزی ملی اُردو سُن سُن کر کرچی کرچی ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم اکیلے زمانے بھر کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے اُردو میں انگریزی کے چھڑکاؤ سے ری کن سائل Reconcile کرنے میں بڑی الجھن محسوس کر رہے تھے کہ اب پائی یعنی بھائی منصور قیصر اور ان کے فرقہ کے ادیبوں نے اُردو میں خالص پنجابی الفاظ کا دخول شروع کر دیا ہے۔ فرقہ منصوریہ کا نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں "میں لیٹر بکس میں خط پا رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے جپھا مارا۔ میں سمجھا الطاف قریشی (مونچھوں والا) ہو گا۔ لیکن مُڑ کر دیکھا تو جھونکا ہوا کا تھا" (اس مثال میں مرکزی خیال ہمارا اپنا ہے لیکن طرزِ ادائیگی فرقہ منصوریہ کی ہے)۔ پوچھو۔ بھائی صاحب یہ کیا چکر ہے یہ اُردو میں پنجابی کیوں پا رہے ہو۔ جواب ملے گا بس "ایویں"۔ ہمارا کہنا یہ ہے بھائی صاحب یہ "ایویں ویویں" نہ کرو۔ اُردو ہماری

قومی ملکیت ہے اسے اپنے گھر کا صحن نہ سمجھو کہ جس طرح چاہو استعال کرو۔

جہاں یہ متقدمین اور حاضرین وغیرہ اُردو زبان کو کچھ نہیں دے سکے وہاں یہ اصناف سخن میں بھی اضافہ نہ کر سکے۔ رام بابو سکسینہ سے لے کر اُردو ادب اور ادبی تحریکات و میلانات پر آج تک لکھنے والے تمام نقادوں کی کتابیں پڑھ جائیے بس آپ کو وہی صدیوں پرانی اصناف سخن کا ذکر ملے گا۔ یعنی اُردو شاعری، ناول، افسانہ، ڈرامہ، طنز و مزاح، مرثیہ، ہجو اور تنقید وغیرہ۔ بڑے بڑے نامور اہل زبان اور بڑی بڑی قدآور ادبی شخصیات کو یہ توفیق نہ ہو سکی کہ ایک دو نئی اصناف کا اضافہ کر دیتے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے یہ توفیق ہمیں عطا کی کہ ہم اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں اور اس مشرقی زبان کو ادب کی ایک بالکل نئی صنف سے نواز رہے ہیں۔ ہم نے بڑی سوچ بچار کے بعد اس نئی صنف کا نام تجویز کیا ہے "نثرینہ"۔ گو یہ کام اب اپنے نقاد دوستوں کا ہوگا کہ وہ ثابت کریں کہ کس طرح نثرینہ اس مشینی دور کی مصروف زندگی کے تقاضے پورے کرنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ ناول لکھنا اور پڑھنا اب بیکاروں کا کام تصوّر ہوتا ہے۔ افسانہ علامتیوں کے زور بازو سے کچھ زیادہ ہی فسانہ بنتا جا رہا ہے۔ غزل کی جگہ فلمی گانوں نے لے لی۔ نظم آزاد ہوتے ہوتے شتر بے مہار ہوتی جا رہی ہے لہٰذا اب نثرینہ ہی کا دَور ہوگا۔ ادبی جمود بلکہ زوال کے اس دَور میں نثرینہ خود ہی اپنا مقام پیدا کرے گی ہمیں یقین ہے کہ وقت کا ساتھ دینے والے اور مثبت شخصیّت کے حامل ادیب جو گھڑیال کے پنڈولم کی طرح ایک ہی ڈگر پر چلنے کے عادی نہیں نثرینہ کو اپنا کر شہرت حاصل کریں گے۔

ظاہر ہے کہ ہر بات میں کیڑے نکالنے والے اور ہر ابھرتی ہوئی تحریک کی مخالفت کر کے سستی اور وقتی شہرت حاصل کرنے والے حضرات نثرینہ میں بھی حسب عادت کیڑے ڈالیں گے اور کہیں گے کہ نثرینہ تو محض بے ربط نثر ہے۔ ایک پیراگراف دوسرے پیراگراف سے اور ایک فقرہ دوسرے فقرے سے رُوٹھا ہوا ہے۔ لیکن ایسے حضرات کو

کیا علم نہیں کہ غزل میں بھی ایک شعر دوسرے شعر سے مختلف ہوتا ہے لیکن پھر بھی پوری غزل کا ایک موڈ اور ایک مخصوص تاثر ہوتا ہے۔ اس طرح بعض کوتاہ اندیش نقادوں کو نثرینہ میں بظاہر بعض باتیں بے ربط نظر آئیں گی لیکن دور اندیش اور باریک بین صاحب ذوق حضرات واضح طور پر یہ محسوس کریں گے کہ نثرینہ میں فلاں مقام پر جو فقرہ یا پیراگراف جڑا گیا ہے یہ فقرہ یا پیراگراف اسی مقام کے لئے معرضِ وجود میں آیا تھا۔ معاف کیجئے ہم نے خود ہی اپنی اس ادبی ایجاد کے بعض محاسن کا ذکر شروع کر دیا۔ حالانکہ یہ کام تو اہلِ نظر کا ہوگا کہ وہ اس بنجر اور بانجھ دور میں نثرینہ کی قابلِ قدر تخلیق، اس کی ضرورت و اہمیت پر اپنے اپنے پیارے انداز میں روشنی ڈالیں۔ لیکن اس خیال کے پیش نظر کہ نثرینہ کی کسی جامع تعریف کے سوال پر قوم میں کہیں مزید انتشار نہ پیدا ہو جائے اور کہیں ادبی حلقے مزید متحارب حلقوں میں تقسیم نہ ہو جائیں ہم خود ہی اپنی طرف سے قوم کو نثرینہ کی جامع تعریف دے دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

> "کوئی خاص بات کہنے کی خاطر بے بات سے بات پیدا کرنا اور
> اپنی بات کے مرکزی نقطہ کو سامنے رکھتے ہوئے باتوں باتوں میں
> بات کہہ جانے کے مشکل فن کا نام نثرینہ ہے۔"

مرکزی وزارت تعلیم۔ چاروں صوبوں کے محکمہ ہائے تعلیم اور اساتذہ کرام سے التماس ہے کہ وہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں نثرینہ کی اسی تعریف کو پڑھائیں۔ ان تمام اربابِ حل و عقد کی مزید وضاحت کی خاطر دنیا کی پہلی نثرینہ کا نمونہ پیش خدمت ہے۔

پیلے چہرے

(زاہد ملک)

رحمت کی چار بیٹیاں تھیں۔ چاروں کی چار جوان بلکہ بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچ رہی تھیں لیکن وہ ان کے ہاتھ پیلے نہ کر سکتا تھا۔ البتہ اس کا اپنا پھولی ہوئی نالوں والا

چہرہ پیلا پڑ چکا تھا۔ ویسے چہرے تو ہم سب کے پیلے پڑ چکے ہیں۔ چہرے انسانی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو یہ وسوسہ کھائے جا رہا ہے کہ ملک ٹوٹنے والا ہے اور چند ایک اس لئے بھی پیلے پڑتے جا رہے ہیں کہ ابھی تک ٹوٹا کیوں نہیں؟ جو دل میں ہوگا چہرے پر لکھا جائے گا۔ چہرہ اخبارات کا سنسر بورڈ نہیں ہوتا کہ اندھیرے کو اُجالا بنا دے۔ لیکن سنسر بورڈ والے بھی کیا کریں۔ وہ کہتے ہیں صاحب ہماری نوکری کا مسئلہ ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ "ویسے آپ نے تو کچھ بھی نہیں لکھا۔ باہر کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں۔ توبہ۔ توبہ۔ ملک کی بڑی بدنامی ہو رہی ہے۔ آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ کیا کچھ کہا جا رہا ہے"۔ ہماری اسی لئے پختہ رائے ہے کہ کسی بھی حکومت کو بدنام کرنے کے سب سے زیادہ متحرک اور مؤثر ادارے خود حکومت کی پبلسٹی کے ادارے ہوتے ہیں۔ افسر تعلقات عامہ کہے گا۔ یار ذرا یہ خبر شائع کر دیں۔ ویسے خبر میں تو جان نہیں لیکن وہ...... پیچھے پڑا ہوا ہے۔

نیا نیا وزیر بنا ہے۔ جس دن اخبار میں اپنی تصویر اور خبر نہ دیکھے اُس دن اُس کا موڈ آف رہتا ہے۔ ادھر سنا ہے کہ سعودی عرب کی خواتین کا موڈ بھی آف ہو گیا ہے۔ جدہ کے مقامی اخبارات کی اطلاع کے مطابق جنوبی سعودی عرب کے ایک قبیلہ لاہمار میں دلہن کی قیمت میں ۲۰ فیصد کمی کر دی گئی ہے۔ عاسر کے گورنر شہزادہ خالد الفیصل نے قبیلہ کے اس فیصلے کو دانشمندانہ اقدام سے تعبیر کرتے ہوئے اس کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا ہے کہ ملک کے جنوبی حصے میں دلہنوں کی گراں قیمتیں مردوں کی شادیوں میں ایک بڑی رکاوٹ تھیں۔ غیر شادی شدہ دوشیزہ کی قیمت دس ہزار سے گھٹا کر آٹھ ہزار اور کسی خاتون کی دوسری شادی کی قیمت آٹھ ہزار سے گھٹا کر پانچ ہزار کر دی گئی ہے"۔ ظاہر ہے یہ موڈ آف ہونے والی ہی بات ہے۔ تیل کی قیمتیں مسلسل بڑھتی ہی جا رہی ہیں اور تیل کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی وجہ سے

دنیا میں مہنگائی اور افراطِ زر کا طوفان بپا ہے۔ لیکن عورت سستی ہوتی جا رہی ہے۔ کیا یہاں کا بھی کوئی گورنر شہزادہ کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتا کہ مَردوں کی قیمت کچھ کم کر دی جائے تا کہ رحمت کی چاروں بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔؟

حکومت کی تلاش میں

حکومت سے مراد ظاہر ہے حکومت ہی ہوتا ہے اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ملک میں سمگلنگ کی اجازت نہیں دی جائے گی یا یہ کہ حکومت نے گندم میں خود کفیل ہونے کا ایک ہنگامی پروگرام منظور کر لیا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب حکومت سمگلنگ کی اجازت نہیں دے گی تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حکومت ماضی میں تو ایسے کاروبار کی اجازت دیتی رہی ہے اور یہ جو آج کل سمگلنگ ہو رہی ہے وہ ماضی میں جاری کیے گئے لائسنسوں پر ہی کی جا رہی ہے اب آیندہ حکومت کوئی نئے پرمٹ جاری نہیں کرے گی۔ البتہ جن پرانے پرمٹوں کی میعاد ابھی ختم نہیں ہوئی وہ مروّجہ قانون کے تحت اشیاءِ ضروریہ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر کر سکتے ہیں۔ اسی طرح حکومت نے گندم میں خود کفیل ہونے کا جو ہنگامی پروگرام منظور کر لیا ہے ظاہر ہے کہ اس نظرِ عنایت پر عوام حکومت کا شکریہ ہی ادا کر سکتے ہیں اور اگر گستاخی کریں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بزرگو یہ

ہنگامی پروگرام سال دو سال پہلے ہی منظور کر لیتے تو آپ کا کیا جاتا۔ لیکن ہم غریب مہنگائی کے پاٹوں میں پسنے سے بچ جاتے۔ حکومت اسی طرح کے دلچسپ بیانات آئے دن جاری کرتی رہتی ہے اور اہل نظر کے لئے تفریح طبع کا سامان پیدا کرتی رہتی ہے۔ لیکن فی الحال اس مضمون میں حکومت کے اس طرح کے مزاحیہ بیانات اور سرکاری ترجمانوں کے قہقہہ آور اعلانات ہمارا موضوع نہیں۔ ہم کسی دوسرے مضمون میں حکومت کے آئے دن کے دلچسپ مزاحیہ بیانات کا تفصیلی ذکر کر کے حکومت کا شکریہ ادا کریں گے کہ وہ آج کل کی بوجھل فضا میں بھی ہم غریبوں کے لئے تفریح کا ہلکا پھلکا پروگرام جاری رکھتی ہے اس مضمون میں تو ہم صرف یہ جاننا چاہیں گے کہ حکومت ہوتی کیا چیز ہے اور حکومت کہتے کسے ہیں۔ مثلاً جب حکومت کہتی ہے کہ ہم ملک میں جیلوں کا جال بچھا دیں گے تو ہر شخص کے ذہن میں حکومت کا ایک تصور اُبھرتا ہے اور ہر شخص کہے گا کہ ظاہر ہے حکومت حکومت ہی ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے سچی بات یہ ہے کہ ہم آج تک نہیں سمجھ سکے کہ کسی ایک معین وقت میں حکومت کس کو کہتے ہیں۔ یہ کہاں بیٹھتی ہے۔ کیا کھاتی پیتی ہے۔ کب سوتی ہے اور کب جاگتی ہے یا جاگتی بھی ہے کہ نہیں۔ مثلاً جب کوئی صاحب کہتے ہیں کہ کل میں نے مینار پاکستان دیکھا تو اس سے یہی سمجھا جائے گا کہ موصوف لاہور گئے ہوں گے اور وہاں تاریخی بادشاہی مسجد اور اتنے ہی تاریخی شاہی قلعہ، جس کی اہمیت قیام پاکستان کے بعد بڑھ گئی ہے، کے پہلو میں عین اس مقام پر گئے ہوں گے جہاں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائداعظم محمد علی جناحؒ کی صدارت میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی تھی۔ لیکن جب کوئی صاحب کہتے ہیں کہ میں کل "حکومت" سے ملا تھا یا میں حکومت سے مل کر سفارش کروں گا کہ وہ ملک سے گداگری ختم کرنے کا کوئی مرحلہ وار پروگرام بنائے تو کم ازکم ہم یہ سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں کہ موصوف کی یہاں "حکومت" سے مراد کیا ہے عام طور پر

لوگ سمجھتے ہیں کہ صدر، وزیر اعظم، وزرار کرام، گورنر حضرات اور ان کے وزرار مل کر حکومت بناتے ہیں یا یہ کہ یہ لوگ حکومت ہوتے ہیں لیکن سیاستدانوں اور دوسرے اہل نظر حضرات کو یہ بھی کہتے سنا جاتا ہے کہ نہیں جناب اصل حکومت تو افسر شاہی کی ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب حکومت کو بھی "اصل" اور "نقل" کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے اور وزرار وغیرہ محض دکھاوے کی اشیار ہوتی ہیں۔ یعنی ظاہر میں حکومت کوئی کرتا ہے اور پس پردہ کوئی دوسرا۔ انہی خیالاں میں غلطاں ایک دن ہم نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ خود ہی اسلام آباد جا کر دیکھیں کہ یہ حکومت جو آئے دن طرح طرح کے خوش اعلانات کرتی رہتی ہے کہاں بیٹھی ہے چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا کہ آئندہ اتوار کو اسلام آباد جا کر نہ صرف حکومت سے مصافحہ کریں گے بلکہ حکومت سے گلے بھی ملیں گے اور عربوں کی طرح خیر سگالی کے جذبے کے اظہار کے طور پر حکومت کے دونوں گالوں کے بوسے بھی لے لیں گے تاکہ بعد میں ہم اپنے دوستوں وغیرہ کو بتا سکیں کہ ہمارا کیا ہے ہم تو حکومت کے بھی بوسے لے چکے ہیں۔ ہم حکومت سے شرف ملاقات کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ حسن اتفاق سے ہمارے ایک عزیز ہمارے گھر آ دھمکے علیک سلیک کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارے عزیز دو کاموں کے سلسلے میں ہمارے پاس آئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہم اس ضمن میں ان کی کچھ مدد کریں اور حکومت سے بات کریں۔ ان کا پہلا کام یہ تھا کہ موصوف کو پستول کا لائسنس بنوانا تھا۔ اور دوسرا یہ کہ بڑے بچے کو فیڈرل گورنمنٹ سکول اسلام آباد میں داخلہ دلوانا ہے۔ بات چیت میں معلوم ہوا کہ وہ چاہتے ہیں کہ اپنی برادری میں عزت افزائی کے لئے جب بھی گاؤں جایا کریں ان کی کمر پر ایک ولائتی پستول بمعہ گولیوں کے پٹکے کے لٹکا ہونا چاہیئے اور جہاں تک بچے کا تعلق ہے وہ لاہور کے کسی بھی اچھے سکول میں داخلہ لینے میں ناکام رہے ہیں بلکہ داخلے کی مسلسل اور برس ہا برس کی کوشش میں بچے کی عمر نو سال ہو چکی ہے اور اب وہ اسلام آباد کے کسی اچھے سکول میں ٹرائی کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لئے بمعہ اپنے کاروبار کے خود بھی اسلام آباد شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔ ہم نے کہا

جہاں تک آپ کے پہلے کام کا تعلق ہے کیا آپ نے سیانوں سے نہیں سن رکھا کہ پستول ہمیشہ بغیر لائسنس کے اپنے پاس رکھنا چاہیئے تاکہ واردات کے بعد آدمی پکڑا نہ جا سکے اور ہمارا تو یہ بھی مشورہ ہے کہ نہ صرف پستول بغیر لائسنس کے ہونا چاہیئے بلکہ قتل کے وقت ہاتھوں پر دستانے چڑھا لینے چاہئیں یا پستول کو رومال سے پکڑنا چاہیئے جیسا کہ خود ہم کرتے رہتے ہیں تاکہ بعد میں پولیس انگلیوں کے نشانات پہچان کر خواہ مخواہ تنگ نہ کرتی رہے بلکہ قتل کے بعد پستول مقتول ہی کے ہاتھ میں تھما دینا چاہیئے جیسا کہ ہم خود کرتے رہتے ہیں تاکہ سیدھا سادا خودکشی کا کیس بن سکے۔ ہم نے اپنے عزیز کو دوسرا قیمتی مشورہ یہ دیا کہ جہاں تک نو سالہ بچے کو پہلی کلاس میں داخلہ دلوانے کا تعلق ہے آپ موجودہ دَور کے حقائق سے آنکھیں نہ چرائیں اور نو سالہ بچے کو بی اے۔ ایم اے کرا کر اس کا مستقبل تاریک نہ کریں بلکہ اسے نو ماہ کا ویلڈنگ کا کورس کروائیں اور سیدھا دوبئی بھیج دیں تاکہ وہاں پہنچ کر ملک کے لئے زرمبادلہ کما سکے اور اپنے عزیز و اقارب کے لئے ویزے حاصل کر سکے۔ ہمارے عزیز نے کہا دیکھیں مجھے یوں نہ ٹالیں۔ میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں اور آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اپنے عزیز کے اصرار پر ہم نے اس کی سفارش کا ارادہ کر ہی لیا۔

معلوم ہوا کہ جہاں تک پستول کے لئے لائسنس لینے کا سوال ہے شہر کا ڈپٹی کمشنر با اختیار ہے اور پستول وغیرہ کی حد تک وہ ہی حکومت ہے۔ چنانچہ ہم ڈپٹی کمشنر صاحب سے ملاقات کا وقت لے کر ان کے دفتر پہنچ گئے۔ ہم پردہ سرکا کر اپنے عزیز کے ہمراہ ان کے کمرے میں داخل ہونے ہی والے تھے کہ ہمیں اندر سے ڈپٹی کمشنر صاحب کی آواز آئی "جی ہاں۔ انہیں فوراً گرفتار کر لو۔ اور ٹھکائی بھی کر دو"۔ ہم نے دل میں سوچا اسے کہتے ہیں "آ بیل مجھے مار"۔ غلطی ہماری ہی ہے کہ اس دَور میں بھی لائسنس لینے چلے آئے حالانکہ اسی طرح کی روزمرہ کے استعمال کی تمام اشیاء باڑہ مارکیٹ میں ہر جگہ سے

مل جاتی ہیں۔ دو چار دستی بم اور کلو دو کلو ہینڈ گرنیڈ بھی بازار سے خریدے جا سکتے ہیں۔ لیکن جونہی ہم کمرے میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ ہمارا خدشہ بے بنیاد تھا۔ صاحب بہادر کسی سے فون پر بات کر رہے تھے۔ غالباً کسی شر پسند کی گرفتاری اور ٹھکائی کے لئے پولیس کو ہدایات دے رہے تھے۔ ہم نے دیکھا کہ ڈپٹی کمشنر صاحب ایک نوجوان لڑکے سے ہیں۔ کسی یونیورسٹی کے طالب علم معلوم ہو رہے تھے لیکن کپڑوں کی تراش خراش اور بالوں کے سٹائل سے کوئی فلمی ہیرو معلوم ہو رہے تھے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے چھ فٹے فوجی کپتان اور ضلع کے بارعب حاکم کو دیکھ کر وحشت طاری ہوتی تھی۔ لیکن آج کل کے ان بنے سنورے، کلین شو اور پری پیکر افسروں کو دیکھ کر.......

ہمارا مطلب ہے۔ یعنی۔ خیر چھوڑیئے ان باتوں کو۔ ہم نے دیکھا ڈپٹی کمشنر صاحب بڑے مصروف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ ہمیں بڑے اچھے لگ رہے تھے نہ جانے ہمارے عزیز کی کیا کیفیت تھی۔ ہم نے کہا "معاف کیجئے۔ ہم نے کہیں آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے۔ آپ کا چہرہ بڑا مانوس سا نظر آ رہا ہے۔" وہ بولے "وہ تو درست ہے لیکن ہم آج کل اسلحہ کے نئے لائسنس جاری نہیں کر رہے۔ حکومت نے ہمیں سختی سے منع کر رکھا ہے بلکہ اب تو ہمیں لائسنس جاری کرنے کا اختیار ہی نہیں رہا۔" جب ہم نے ان کو تفصیل سے بتایا کہ سائل پر امن شہری ہیں بلکہ شہری بھی کیا ہیں صرف پر امن ہی ہیں، اس لئے ان کو لائسنس دینے سے امن و امان میں کوئی مزید خلل واقع نہ ہوگا۔ تو ڈپٹی کمشنر صاحب نے کہا کہ اگر ایسا معاملہ ہے تو پھر آپ حکومت سے مل لیں ممکن ہے ایز اے سپیشل کیس (As a special case) حکومت آپ کو لائسنس دے دے۔ ہم نے ان کے حسنِ سلوک کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھا "معاف کیجئے حکومت سے آپ کی مراد کیا ہے۔ ہم کس سے مل لیں"۔ معلوم ہوا کہ صوبائی ہوم سیکرٹری سے ملنے کے لئے کہا گیا ہے۔ اتفاق سے صوبائی ہوم سیکرٹری بھی کسی اہم اجلاس میں شرکت کے لئے ان دنوں اسلام آباد میں موجود تھے۔ دوسرے دن

اپنے عزیز کو ساتھ لئے ہم ان کے دربار میں بھی حاضر ہو گئے۔ ان کے دفتر سے کسی ولائتی تمباکو کی بڑی مسحور کُن خوشبو آ رہی تھی۔ مدعا بیان کیا تو موصوف نے منہ سے پائپ نہ نکالتے ہوئے کہا "ساری Sorry ہمیں سینٹر (مرکزی حکومت) سے نئے لائسنس جاری کرنے کے لئے منع کر دیا گیا ہے۔ ہم نے کہا جناب اگر حکومت نے اسلحہ کے لائسنس جاری کرنے سے منع کر دیا ہے تو کیا یوں نہیں ہو سکتا کہ آپ ہمارے عزیز کو ایز اے سپیشل کیس ہی لائسنس دے دیں تاکہ یہ بھی خوش ہو جائیں اور حکومت کی پابندی بھی برقرار رہے۔ انہوں نے پھر کہا" ساری Sorry ہم نے کہا" آپ کے تمباکو کی خوشبو بہت ہی بھینی بھینی ہے۔ یہ آپ نے کہاں سے لیا تھا؟ ہمارے ایک دوست بھی ایسا ہی تمباکو پیتے ہیں وہ کہتے ہیں جب میں انار کلی میں یہ تمباکو پیتے چلتا ہوں تو دس بیس لڑکیاں بے اختیار پیچھے پیچھے چلنا شروع کر دیتی ہیں کیا آپ کا بھی کوئی ایسا تجربہ ہے؟"۔ موصوف مسکرائے اور منہ سے پائپ نہ نکالتے ہوئے بولے " ساری۔ میں اس ضمن میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہر طرح کا تمباکو، پاکستان ٹوبیکو بورڈ کے انڈر آتا ہے اور یہ سینٹرل سبجیکٹ ہے۔ آپ اس سلسلہ میں بورڈ سے رجوع کریں"۔ ہم نے اپنے عزیز کی طرف دیکھا کہ کیا ارادہ ہے اب پہلے پاکستان تمباکو بورڈ سے رجوع کریں یا آپ کے پستول کے لائسنس کے لئے حکومت سے ملا جائے۔ لیکن ہمارے عزیز کے چہرے سے صاف عیاں تھا کہ پہلے لائسنس حاصل کر لیا جائے تو بہتر رہے گا۔ ہم نے پھر صوبائی ہوم سیکرٹری سے پوچھا" معاف کیجئے۔ پستول کے لائسنس کے لئے مرکزی حکومت میں کس سے ملا جائے"۔ انہوں نے کہا "وہ آپ وزارتِ داخلہ کے جائنٹ سیکرٹری (رابطہ) سے مل لیں"۔ ہم نے ہوم سیکرٹری صاحب کی معلومات افزا معلومات کا شکریہ ادا کیا اور ان کے پائپ کے خوشبو دار تمباکو کی خوشبو سے خوشبو خوشبو کمرے سے باہر آ گئے۔ تیسرے دن جائنٹ سیکرٹری (رابطہ) سے رابطہ پیدا کیا گیا تو پہلے تو وہ بضد رہے کہ اسلحہ کے لائسنس جاری کرنا چونکہ صوبائی سبجیکٹ ہے۔ اس لئے

صوبائی ہوم سیکرٹری سے ملا جائے۔ لیکن ہمارے مسلسل اصرار پر انہوں نے چوتھے دن بارہ بجے ملاقات کا وقت دے دیا۔ ہم خوش ہوئے کہ اچھا ہوا مرکزی حکومت سے بھی براہ راست ملاقات ہو جائے گی اور وقت مقررہ پر یعنی پورے بارہ بجے جے ایس کے دفتر پہنچ گئے۔ مدعا بیان کیا گیا اور اس بات پر بہت زور دیا گیا کہ ہمارے عزیز ایک انتہائی شریف اور بے ضرر سی شخصیت ہیں۔ پستول کا ناجائز استعمال کبھی نہ کریں گے اور کبھی انہوں نے پستول کا ناجائز استعمال کیا بھی تو پستول کی نالی کا رُخ اُن کی اپنی ہی کنپٹی کی طرف ہوگا۔ یعنی شاید کبھی شوقیہ خودکشی کر لیں تو کر لیں ورنہ پستول کا اور کوئی بھی استعمال نہ ہوگا سوائے نمائش کے۔ جے۔ ایس ہماری باتیں خاموشی سے سنتے رہے پھر کہنے لگے "بھائی صاحب۔ حکومت کے ایک آرڈر کے تحت نئے لائسنس جاری نہیں کئے جا سکتے"۔ ہمارا منہ لٹک سا گیا۔ لو یہ بھی حکومت نہیں ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ "حکومت" نے منع کر رکھا ہے نہ جانے یہ حکومت کیا چیز ہے؟ ہم نے کہا "صاحب ہم نے سنا ہے آپ بڑے بااختیار ہیں اور آپ رُولز بھی ریلیکس کر سکتے ہیں اور رولز ریلیکس کر کے ایز اے سپیشل کیس پرمٹ بھی جاری کر سکتے ہیں۔ ہمیں خواہ ڈیڑھ دو انچ کے پستول کا ہی لائسنس دے دیا جائے۔ ہم پستول کا کوَر ذرا بڑے سائز کا بنوا لیں گے"۔ جائنٹ سیکرٹری صاحب نے جب دیکھا کہ ہم بہت ہی بضد ہیں تو انہوں نے کہا کہ اگر آپ کو پسٹل کا اس قدر ہی شوق ہے تو آپ وزیر داخلہ سے مل لیں شاید وہ آپ کو سیاسی بنیاد پر پرمٹ دے دیں۔ بائی دی وے آپ کا کون سی سیاسی پارٹی سے تعلق ہے"؟ ہم نے کہا ہماری سیاسی پارٹی وہی ہے جو وزیر داخلہ صاحب کی پارٹی ہے بلکہ ہم تو ان کی پارٹی کے ادنیٰ سے کارکن ہیں۔

وزیر داخلہ بڑی عوامی قسم کی شخصیت تھے۔ ہم نے دیکھا ان کے ڈرائینگ رُوم میں دس بارہ اور سائل بھی بیٹھے ہیں۔ وزیر صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے

ہمیں انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے ایک خالی کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔ حالانکہ ظاہر ہے وہ ہمیں اشارے سے خالی کرسی پر بیٹھنے کو نہ بھی کہتے تو ہم خالی کرسی پر ہی بیٹھتے، کسی کی گود میں تو جا کر نہ بیٹھ جاتے۔ وزیر داخلہ ایک فون سے فارغ ہوئے تو دوسرے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ دوسرا فون سننے لگے۔ "جی نہیں۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں نے ایس پی کو کہہ دیا ہے۔ آیندہ سال دو سال جیل ہی میں رہے گا۔ آپ مطمئن رہیں...... جی۔ جی.... وہ بھی ہو جائے گا۔" فون سننے کے بعد وزیر داخلہ ہماری طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا "فرمایئے میں کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" ہم نے اپنے عزیز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا اور یہ بھی کہا کہ گو یہ کام تو معمولی سا ہے اور ایک چھوٹی سی پستول کے لئے آپ کو زحمت دینا بڑا عجیب سا لگتا ہے لیکن چونکہ "نیچے" سے کام نہیں ہوا اس لئے آپ کے پاس آنا پڑا۔ وزیر داخلہ نے کہا: "قبلہ یہ معمولی سا کام نہیں ہے حکومت اب نئے لائسنس جاری نہیں کر رہی۔ میرے پاس اس طرح کی کوئی دو سو درخواستیں پڑی ہیں لیکن حکومت کی طرف سے پابندی ہے۔" یہ کہہ کر انہوں نے ہماری درخواست لے لی اور کہا کہ "آپ تو اپنے آدمی ہیں۔ فکر نہ کریں۔ جونہی حکومت نے نئے پرمٹ جاری کرنے کی اجازت دے دی۔ سب سے پہلے آپ ہی کا کام ہوگا۔" تو گویا وزیر بھی حکومت نہیں۔ پھر حکومت کون ہے۔ سائل کہاں جائے۔ لیکن ہمارے عزیز ہمارے احسانات کے بوجھ تلے دبے جا رہے تھے کہ ان کی خاطر ہم حکومت کا ہر دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ حکومت کسی بھی دروازے سے نہ مل سکی۔ شاید اندر کہیں سو رہی تھی کہ اس حالت میں کسی غیر محرم کے سامنے آنا مناسب نہ ہو۔

ان حالات و واقعات کی روشنی میں ہم نے حکومت سے ملنے اور عربوں کی طرح خیر سگالی کے جذبے کے اظہار کے طور پر حکومت کے دونوں گالوں کے بوسے لینے

اور ہمارے عزیز نے نمائشی پستول کا لائسنس لینے کا ارادہ ترک کر دیا۔ لیکن اتفاق سے ہمیں شہر میں ہونے والی ایک ایسی شادی میں شرکت کا ایک بڑا خوبصورت سُرخ رنگ کا پھُمن دار دعوت نامہ ملا۔ جس سے معلوم ہوا کہ صدر مملکت بھی شادی میں شریک ہوں گے۔ ہماری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ایک تو اس لئے کہ خود حکومت سے ملاقات ہو جائے گی اور دوسرے اگر ممکن ہوا تو اپنے عزیز کے متعلق بھی بات کرلیں گے۔ ہم نے صدر صاحب کے نام ایک عمدہ سے کاغذ پر بڑی نفاست سے درخواست لکھوا کر جیب میں رکھ لی۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ ہمارے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور سوالات پیدا ہونے لگے (ا) آیا اتنے بڑے بڑے مہمانوں کی موجودگی میں صدر مملکت سے بات کرنا ممکن ہو گا۔ اور (ب) اگر ملاقات ہو بھی جائے تو کیا ملاقات کا مقصد۔ پستول کے لائسنس کا حصول۔ اس قدر وزنی جواز ہے کہ بھری محفل میں صدر سے درخواست کی جائے۔ پھر نہ جانے کیوں دل میں خود بخود بڑے لوگوں سے پہلی ملاقات (ہماری نہیں دوسروں کی) کے کئی ایک دلچسپ واقعات ہمیں یاد آنے لگے اور ایسی پہلی ملاقاتوں کے ماضی میں پڑھے ہوئے واقعات بھی آنکھوں کے سامنے آنے لگے جن سے سائلوں کی زندگیاں ہی بدل گئی تھیں۔ پھر ہم نے احتیاطاً ڈیل کارنیگی کی وہ شہرۂ آفاق کتابیں بھی پڑھ ڈالیں جن میں دوسروں پر چھا جانے کے گُر بتائے گئے ہیں اور جنہیں پڑھ کر آپ صدر کیا گورنر سے بھی بلا جھجک مل سکتے ہیں۔ مختلف کُتب کا مطالعہ کرنے کے بعد مقررہ وقت ہم اور مقررہ گھڑی صدر مملکت دلہن کے گھر پہنچ گئے۔ اتفاق سے دولہا میاں ہم دونوں سے بھی پہلے وہاں پہنچ چکے تھے۔ صدر مملکت کے پہنچتے ہی دولہا دلہن کو ایک بڑے صوفے پر لا بٹھایا گیا اور اچکن میں ملبوس ایک بزرگ نے بڑے مودبانہ انداز میں صدر صاحب کو صوفے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم سمجھے کہ شاید صدر مملکت اپنے گہرے اسلامی رجحانات کے پیش نظر بچوں کا نکاح پڑھائیں گے اور اس کے بعد ہم شرکا میں کوئی سپیشل چھوہارے تقسیم کئے جائیں

گے لیکن یہ کیا؟ صدر مملکت تو دولہا دلہن کے درمیان جا کر بیٹھ گئے اور لڑکی لڑکے کے ورثاء ہاتھ باندھ کر صوفے کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ مہمانوں کی نظریں بھی اس طرف جم گئیں۔ کوئی صدر صاحب کو دیکھ رہا تھا اور کوئی دلہن کو۔ کیمرہ مین آگے بڑھے اور گروپ فوٹو لینے لگے۔ دلہن بہت شرمائی شرمائی اور سر جھکائی جھکائی نظر آ رہی تھی۔ ایک بزرگ خاتون نے آگے بڑھ کر دلہن کی ٹھوڑی ذرا اونچی کی اور کہا بیٹے ذرا چہرہ تو اوپر کرو گھبراؤ نہ۔ یہ اپنے ہی آدمی ہیں آپ کو کچھ نہیں کہیں گے۔ صدر صاحب بھی دلہن کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور ایک دو مرتبہ سر ہلایا یعنی ہاں ہاں بے شک تھوڑا سا چہرہ اوپر اٹھا لو ہماری حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ فوٹو گرافر بھی تصویریں لینے لگے اور یہ سلسلہ کوئی دو تین منٹ چلتا رہا۔ اس کے بعد صدر مملکت صوفہ سے اٹھ گئے۔ ہم نے یہ موقع غنیمت جانا اور صدر صاحب کو انتہائی خوشگوار موڈ میں دیکھ کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ صدر مملکت سمجھے کہ شاید یہ صاحب بھی منتظمین میں سے ہیں اور ہماری تشریف آوری پر شکریہ ادا کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ ہم صدر صاحب سے بڑے پُراعتماد انداز میں ملیں گے اور ملتے ہی کہیں گے کہ "مسٹر پریذیڈنٹ۔ آپ اس وقت تیسری دنیا بلکہ چوتھی اور پانچویں دنیا کے بھی مقبول ترین صدر ہیں۔ دنیا کے کئی ممالک آپ کے انقلابی اور دور رس منصوبوں پر اپنے اپنے ہاں عمل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں"۔ ہم نے سوچ رکھا تھا کہ جونہی ہم یہ فقرات کہیں گے صدر مملکت کہیں گے "آپ کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھائیے تاکہ میں بعض قومی معاملات پر آپ کے خیالاتِ عالیہ سے مستفید ہو سکوں"۔

لیکن صدر صاحب سے ہاتھ ملا کر ہم ان کو متاثر کرنے کی بجائے خود متاثر ہو گئے۔ ان کی بارعب اور پُروقار شخصیت کے سامنے ہم سب کچھ بھول گئے۔ ہمیں بڑی شدت سے احساس ہونے لگا کہ یہ ہم کیا کر بیٹھے ہیں صدر صاحب سے ہاتھ ملا بیٹھے ہیں اور موصوف بھی دلہا دلہن کی روح پرور قربت سے اتنے خوشگوار موڈ میں ہیں کہ بڑی گرمجوشی سے ہمارا ہاتھ

ہلائے ہی جارہے ہیں۔ نہ جانے ہمیں کس طرح خیال آگیا کہ ہم نے صدر صاحب سے اپنے عزیز کے لیے پستول کے لائسنس کی بات بھی کرنی ہے، چنانچہ ہم اور تو کچھ نہ کہہ سکے، البتہ بڑی مشکل سے اور رک رک کر کہا "سر پس۔ پس۔ پستول"۔ گھبراہٹ میں صدر صاحب نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "کدھر ہے؟ کدھر ہے؟" صدر صاحب کے حفاظتی عملہ کے کان کھڑے ہو گئے بلکہ ان کے چہروں پر صرف کان ہی کان نظر آنے لگے وہ صدر مملکت کے اردگرد اکٹھے ہو گئے۔ دوسرے مہمان بھی ہماری طرف متوجہ ہو گئے۔ سیاہ چشمہ لگائے ہوئے صدر صاحب کے ایک محافظ نے اپنی جیب سے پستول نکال لیا۔ صدر صاحب نے اپنے اوسان بحال کرتے ہوئے پھر ہم سے پوچھا "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" ہم نے ہمت سے کام لے کر کہا "مسٹر پریذیڈنٹ کوئی خاص بات نہیں۔ ہمارے ایک عزیز کو پستول کا لائسنس درکار تھا جب کہیں شنوائی نہ ہوئی تو سوچا آپ ہی سے خصوصی اجازت لے لی جائے، آپ تو غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اس غریب کو بھی ایک پستول عنایت فرمائیں"۔ یہ کہہ کر ہم نے جیب سے درخواست نکال لی۔ صدر صاحب نے ہمارا ہاتھ چھوڑتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے یاد ہے حکومت نے اسلحہ کے نئے لائسنس جاری کرنے پر پابندی لگا رکھی ہے۔ تاہم آپ میرے اے۔ ڈی۔ سی کو درخواست دے دیں۔ میں پتہ کر دوں گا"۔

تو گویا صدر صاحب بھی "حکومت" سے پتہ کریں گے اور "حکومت" نے نئے لائسنس جاری کرنے پر پابندی لگا رکھی ہے!! یا اللہ یہ "حکومت کیا چیز ہے؟ اچھا اگر کسی شادی کی تقریب میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل سے بھی اسی طرح برابری کی سطح پر دوستانہ اور خوشگوار ملاقات ہو گئی تو ان سے بھی بات کر لیں گے۔ دریں اثناء ہمیں آج ہی ہمارے عزیز کا لاہور سے ایک خط موصول ہوا ہے جس میں اور باتوں کے علاوہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے دس سالہ بیٹے کو لاہور کے "انٹرنیشنل ویلڈنگ ٹریننگ سنٹر" میں داخل کروا دیا ہے تاکہ ویلڈنگ کا کورس مکمل کرنے کے بعد دوبئی جا سکے۔

زنانہ کرکٹ کمنٹری

جب بھی کوئی غیر ملکی کرکٹ ٹیم آتی ہے تو چند ایک دوستانہ میچوں کے علاوہ تین چار غیر دوستانہ یعنی ٹیسٹ میچ بھی کھیلتی ہے۔ دوستانہ میچ تو ظاہر ہے دوستانہ ہی ہوتے ہیں یعنی اگر ایک ٹیم دوسری ٹیم کی دوستی میں دو چار وکٹیں گرا لے تو دوسری ٹیم زیادہ بُرا نہیں مانتی بلکہ بعض اوقات تو خود ہی ریلیکس ہو کر کھیلتی ہے تاکہ پہلی ٹیم اس کی قوت کا صحیح اندازہ نہ لگا سکے اور ٹیسٹ میچ میں بھی لُوز بال پھینکے۔ یعنی دوستانہ میچ میں اس کی دوستانہ سٹریٹیجی چلتی رہتی ہے لیکن غیر دوستانہ یعنی ٹیسٹ میچوں میں ایک قسم کی جنگ کا سا سماں ہوتا ہے اور بعض اوقات تو ایک ٹیم کے فاسٹ باؤلر دوسری ٹیم کے کسی نہ آؤٹ ہونے والے بیٹسمن کو جان بوجھ کر ہٹ (زخمی) کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور نیچے اوپر اس طرح کے خوفناک بونسر پھینکتے ہیں کہ بیٹسمین کو فوراً اپنی ہونے والی بیوہ اور بچوں کا خیال آ جاتا ہے۔ سُنا ہے کہ ایسی جنگی فضا میں بعض مسلمان کھلاڑی سورۂ یٰسین کی تلاوت شروع کر دیتے ہیں۔ اُدھر تماشائیوں کی بھی حالت عجیب و غریب

ہوتی ہے وہ ایک ایک بال سانس روک کر دیکھتے ہیں۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ بعض کمزور اعصاب کے تماشائی باؤلر کے سٹارٹ لینے کے ساتھ ہی سر کو پھر باؤلر کے دوڑنے کے ساتھ ساتھ پوری گردن کو اور جب باؤلر بال گھما کر پوری شدت سے پھینکتا ہے تو کمر کو بھی جھکا لیتے ہیں لیکن ان کی نظر بال پر ہی رہتی ہے اور جب بال بیٹ پر لگنے سے ٹِک کی آواز آتی ہے تو پھر سیدھے ہو جاتے ہیں اور ساتھ بیٹھے تماشائی سے کہتے ہیں "توبہ۔ بڑی خطرناک بال تھی۔ بیٹسمین بڑی مشکل سے بچا ہے۔" ساتھ والا تماشائی اگر بیٹسمین کا حامی ہو تو وہ کہتا ہے "ایسے بال تو اس کے لئے کھیر ہیں۔ سڈنی میں ایسے ہی بالوں پر اس نے ڈبل سینچری بنائی تھی۔" اور اس طرح یہ تماشائی پانچ دن تک کئی ایک سنسنی خیز مراحل سے گزرتے ہیں۔ ہم نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ غیر دوستانہ میچ دیکھنے والے بعض کمزور دل حضرات کو میچ کی سیریز ختم ہونے کے بعد ہمدرد دواخانہ کا خمیرہ گاؤزبان عنبری دو چار ماہ تک استعمال کرنا پڑتا ہے کہ اس کی چھ ماشے روزانہ خوراک دل و دماغ اور بصارت کو قوت دیتی ہے اور اگر یہ دوستانہ اور غیر دوستانہ میچ بھارت اور پاکستان کی ٹیموں کے درمیان ہوں تو پھر کھیل کا میدان جنگ بدر کا سا میدان بن جاتا ہے۔ تماشائی اپنے اپنے کھلاڑیوں کو کھل کر داد دینے کے علاوہ اپنے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو سمجھاتے بھی ہیں کہ "اے غفور الرحیم یہ عزت بے عزتی کا مسئلہ ہے تو ہی ہماری لاج رکھنے والا ہے۔" کھیل میں وقفہ کے دوران اگر تماشائیوں کی تفریح طبع کے لئے انتظامیہ نے ملٹری بینڈ کا انتظام کر رکھا ہو تو بینڈ میدان میں پہنچ کر جو ترانہ چھیڑتا ہے اس کا مکھڑا ہوتا ہے "اُٹھ مردِ مجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا" اور بینڈ کے آگے آگے پنے تلے پُرعزم قدم اٹھاتے ہوئے بینڈ ماسٹر کی شان دیکھنے والی ہوتی ہے جیسے سیدھا سری نگر پہنچ کر ہی دم لے گا۔ اس طرح کی جنگی صورت حال میدان کے اندر تو ہوتی ہی ہے لیکن پورے ملک میں بھی ایک قسم کی کام چھوڑ ہڑتال ہو

جاتی ہے۔ اور ہر صاحب ذوق ریڈیو سے کان لگائے یا ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھا نظر آتا ہے۔ کھانا بھی وہاں کھایا جا رہا ہے اور چائے بھی وہاں ہی پی جا رہی ہے لیکن خود چشم تصور سے سٹیڈیم میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایسے میں اگر گھر میں کوئی مہمان آجائے اور وہ باتوں باتوں میں صاحب خانہ سے پوچھ لے کہ ماشاءاللہ آج کل کتنے بچے ہیں تو جواب ملے گا "ٹو ففٹی فار سکس" (دو سو پچاس رنز اور چھ کھلاڑی آؤٹ) لیکن اس وقت کرکٹ میچوں میں عوام کی اس طرح کی دلچسپیاں اور خواص کی اس کی بدحواسیاں ہمارا موضوع نہیں۔ ہم کسی اور مضمون میں کرکٹ میچوں کے اس طرح کے دلچسپ پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالیں گے لیکن فی الحال ہم صرف کرکٹ کمنٹری کے موضوع پر کچھ کہنا چاہتے ہیں اور حسب معمول کچھ قیمتی مشورے دینا چاہتے ہیں۔

ہم بچپن سے دیکھتے چلے آئے ہیں کہ ایسے ٹیسٹ میچوں کی جب ریڈیو پر کمنٹری ہوتی تھی یا اب قومی نشریاتی رابطہ پر ٹیلی ویژن پر یہ کھیل دکھایا جاتا ہے تو دونوں صورتوں میں کمنٹری مرد حضرات کرتے ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ آخر اس رواں کمنٹری پر مردوں ہی کی اجارہ داری کیوں ہے؟ ہمیں تو بعض اوقات معزز بیگمات کے ان اخباری بیانات میں سو فیصد صداقت نظر آتی ہے جن میں وہ اکثر فرماتی ہیں کہ مرد ہر مقام پر ہمارے ساتھ زیادتی کرتے ہیں اور دن رات ہمارے حقوق پر ڈاکہ ڈالتے رہتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مرد حضرات کس طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ وہ معزز خواتین سے بہتر رواں کمنٹری کر سکتے ہیں؟ آخر کمنٹری ہے کیا؟ بولنا، بولنا اور بولنا۔ اور اس میں کس کو شک ہو سکتا ہے کہ بولنے کے سلسلہ میں خواتین مردوں کی بولتی بند کر سکتی ہیں ہمارا دعویٰ ہے کہ اگر عورتوں اور مردوں کے بولنے کا کوئی مقابلہ ہو تو عورتیں یوں بولیاں ماریں گی کہ چند ہی منٹوں میں مرد بول اٹھیں گے کہ اے نیک دل عورتو! ہم تو بس بول گئے ہیں خدا کے لئے اب ہمیں مزید بول نہ سناؤ۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ

مغربی ممالک میں بھی جہاں کہ عورت بہت حقوق شناس ہے اور ہر ہر بات میں مرد کے آگے رہتی ہے وہاں بھی خاتون رہنماؤں کو یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ریڈیو ٹی وی کی کمنٹری پر مردوں کا غاصبانہ قبضہ ختم کر کے مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ افسوس کہ ہر ثبت اور نئی تجویز بالآخر ہمیں ہی دینی پڑتی ہے۔ بہرحال جہاں ایک طرف اُردو جاننے والی انگریز میموں کو، جو کہ ہمارے خیالات سے براہ راست مستفیض ہو سکیں، ہمارا مشورہ ہے کہ وہ آگے بڑھ کر مائیک اپنے ہاتھ میں لے لیں وہاں پاکستان اور بھارت کے بھی کرکٹ کنٹرول بورڈوں کے حکام اعلیٰ کو ہم کہنا چاہیں گے کہ وہ از خود بہتر کرکٹ کی خاطر خواتین سے کرکٹ کمنٹری کروانے کا تجربہ کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ تجربہ کامیاب ہوگا اور اس کے تین بڑے فائدے ہوں گے (ا) ٹیلی ویژن پر زنانہ کمنٹری سے ٹیلی ویژن کے مردانہ ناظرین کا حلقہ بڑھے گا (ب) بہتر کمنٹری سے کھیل کرکٹ میں عوام کی دلچسپی مزید بڑھے گی اور کھیل کو فروغ حاصل ہوگا اور (ج) حکومتِ وقت خواتین کے کسی بڑے جلسہ عام میں اعلان کر سکے گی کہ جو کام پچھلے تینتیس سال میں مختلف حکومتیں نہ کر سکیں وہ آپ کی موجودہ ہر دلعزیز حکومت نے کر دکھایا ہے اور کرکٹ کمنٹری کو خواتین کے سپرد کر کے خواتین کے حقوق کی بحالی کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ (تالیاں)

اس موقع پر ہم یہ وضاحت ضروری سمجھتے ہیں اور کرکٹ کنٹرول بورڈ اور متعلقہ حکام کو یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں فی الحال ایسی کوئی خاتون نہیں جس کی خاطر اور جس کو کرکٹ کمنٹری کا چانس دلانے کے لئے ہم نے یہ مضمون لکھنا شروع کیا ہے ویسے بھی ہمیں اپنے حلقہ احباب میں کوئی ایسی خاتون نظر بھی نہیں آرہی جو کرکٹ کمنٹری کے لئے موزوں ہو۔ خود ہمارے اپنے حلقے اور ہمارے دوستوں کے حلقوں میں زیادہ تر خواتین ایسی ہیں جو اندرون خانہ کھیلوں میں زیادہ دلچسپی رکھتی ہیں۔ اندرون خانہ کھیلوں سے ہماری مراد ہے ٹیبل ٹینس، بیڈمنٹن وغیرہ۔ اپنے حلقے میں چند ممتاز شاعرات بھی

شامل ہیں لیکن وہ بھی زیادہ تر اندرون خانہ مشاعروں میں چمکتی ہیں البتہ کشور ناہید ایسی خاتون ضرور ہیں جن کی قابلِ رشک اندرونِ خانہ کارکردگی کا تو ہر شخص معترف ہے ہی لیکن اس کے ساتھ وہ اعلیٰ انتظامی صلاحیتیں بھی رکھتی ہیں انہیں زبانِ اردو پر بھی ملکہ حاصل ہے اور زبان (بولنے والی) کی بھی ملکہ ہیں اس لحاظ سے ہمارے نزدیک وہ زنانہ کرکٹ کمنٹری کے لئے موزوں ترین زنانہ شخصیت ہیں۔ کرکٹ کنٹرول بورڈ کے حکام چاہیں تو ہماری معرفت کشور ناہید سے رابطہ پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ اس وقت ہمارے علم میں کوئی ایسی خاتون نہیں جو امید سے ہو یعنی جو چاہتی ہو کہ اسے کمنٹری کرنے کا زنانہ کام سونپ دیا جائے۔ ہم تو صرف اصول کی بات کر رہے تھے کہ ہماری دیانتدارانہ رائے میں عورت مرد سے بہتر کمنٹری کر سکتی ہے۔

ہم اپنی دُور بین اور باریک بین نظروں سے دیکھ رہے ہیں کہ جب مرد حضرات عورتوں کا کمنٹری کا حق انہیں واپس کر دیں گے اور زنانہ کرکٹ کمنٹری کا نظام نافذ ہو جائے گا تو ٹیلی ویژن پر کچھ اس طرح کی کمنٹری ہوا کرے گی۔

خاتون اناؤنسر: "ناظرین ابھی چند ہی لمحوں میں ہم آپ کو قذافی سٹیڈیم لاہور لئے چلتے ہیں جہاں پاکستان اور بھارت کے درمیان کرکٹ میچوں کی موجودہ سیریز کا تیسرا ٹیسٹ میچ کھیلا جا رہا ہے۔ یہ پروگرام ہم آپ کی خدمت میں کڑک واشنگ پوڈر بنانے والے ادارے کی طرف سے پیش کریں گے۔" اس کے بعد کڑک واشنگ پوڈر کا اشتہار دکھایا جاتا ہے۔ ٹیلی ویژن کی سکرین پر بجلی کی زبردست چمک اور کڑک سنائی اور دکھائی دیتی ہے۔ سمندر کنارے ایک خوبصورت شیریں دہن دوشیزہ کڑک واشنگ پوڈر سے کپڑے دھوتی نظر آتی ہے۔ میلے کپڑوں کے ڈھیر کے پاس ایک چھوٹا سا کڑک واشنگ پوڈر کا ڈبہ بلکہ ڈبیہ نظر آتی ہے۔ دوشیزہ کہتی ہے "جی ہاں یہ ڈبہ ان ڈھیر سارے کپڑوں کے لئے کافی ہے بلکہ اس اکانومی سائز ڈبہ میں جو پوڈر بچ جائے گا اس سے آپ اپنی پسند کے ہمسایوں کے کپڑے بھی

دھو سکتے ہیں۔ اس کے بعد سطح سمندر پر تیرتی ایک موٹر کشتی میں اسی دوشیزہ اور ایک لڑکے کو دکھایا جاتا ہے کہ دھوپ اور ہوا میں کپڑے سکھا رہے ہیں۔ کپڑے ہوا میں اڑے اڑے جا رہے ہیں۔ دونوں کڑک کی خوبیاں گا گا کر بیان کرتے ہیں...... اشتہار کے بعد اناؤنسر پھر نمودار ہوتی ہے۔ "آیئے ناظرین قذافی سٹیڈیم چلتے ہیں جہاں آج کے ٹیسٹ میچ پر رواں کمنٹری کریں گی پروین رحمان اور شمائلہ اشرف اور مبصر کے فرائض سرانجام دیں گی محترمہ عفت آرا۔ ناظرین ہمارے سمیت قذافی سٹیڈیم پہنچ جاتے ہیں۔ کیمرہ سٹیڈیم پر ایک طائرانہ نظر ڈالتا ہے اور پھر دونوں ملکوں کے جھنڈوں کا کلوزاپ دکھاتا ہے پس منظر سے پروین رحمان کی آواز ابھرتی ہے۔

"السلام علیکم ناظرین۔ قذافی سٹیڈیم میں پاکستان اور بھارت کی کرکٹ ٹیموں کے درمیان تیسرا کرکٹ میچ شروع ہونے میں ابھی چند لمحے باقی ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں۔ پہلا ٹیسٹ میچ پاکستان اور دوسرا بھارت جیت چکا ہے اب دیکھیں تیسرے ٹیسٹ کا کیا رزلٹ رہتا ہے۔ ناظرین میں آپ کو دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کا تعارف کرا دوں (پھر تعارف کرایا جاتا ہے اور بارھویں کھلاڑیوں کے نام بھی بتائے جاتے ہیں) اس کے بعد کیمرہ ٹی وی بوتھ دکھاتا ہے۔ سامنے میز پر مائیک رکھے تین خواتین کو دکھایا جاتا ہے ان میں سے دو خواتین چودھویں کے چاند کی طرح پُرشباب نظر آتی ہیں جبکہ تیسری محترمہ قدرے بزرگانہ شکل و صورت میں نظر آتی ہے۔ پروین رحمان بولتی ہیں۔ ناظرین دونوں ٹیموں کے کپتانوں نے ٹاس کیا۔ ٹاس پاکستان نے جیت لیا ہے اور پاکستان ٹیم کے کپتان مشتاق نے بھارتی ٹیم کو پہلے کھیلنے کی دعوت دی ہے۔ پاکستان کی ٹیم فیلڈنگ کے لئے گراؤنڈ میں داخل ہونے والی ہے جبکہ بھارت کی طرف سے اوپن کریں گے سنیل گواسکر اور ان کا ساتھ دیں گے مہندر امرناتھ ـــ ناظرین میں دیکھ رہی ہوں کہ اس وقت قذافی سٹیڈیم میں بیس ہزار کے قریب تماشائی آچکے ہیں اور ہمارا اندازہ ہے کہ آہستہ آہستہ تماشائیوں

کی تعداد پچاس ساٹھ ہزار تک پہنچ جائے گی۔ ناظرین یہاں موسم بہت خوشگوار ہے۔ مطلع بالکل صاف ہے۔ اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی ہے۔ خواتین کے انکلوژر میں بھی خاصی گہما گہمی نظر آ رہی ہے۔ جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں لیڈیز نے رنگ برنگے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اکثر خواتین نے موسم کی مناسبت سے پرنٹڈ لان کی شلوار قمیض پہن رکھی ہیں۔ لیکن بعض خواتین امریکی جارجٹ کی ساڑھیوں میں بھی نظر آ رہی ہیں۔" اچانک ایک آواز ابھرتی ہے " پروین ایک دو نے تو میکسی بھی پہن رکھی ہے۔ وہ دیکھو تیسری لائن میں پہلی سیٹ والی خاتون۔" "ہاں۔ ہاں، شمائلہ تم نے ٹھیک کہا۔ لیکن میری رائے میں یہ میکسی پہننے کا موقع نہ تھا۔ ناظرین مشتاق کی قیادت میں پاکستانی سائڈ گراؤنڈ میں داخل ہو رہی ہے۔ مشتاق حسب معمول اپنے ساتھیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ میاں داد عمران خان اور سکندر بخت نے سبز بارڈر والی سویٹریں پہن رکھی ہیں جبکہ دوسرے کھلاڑیوں نے صرف چست پتلونیں اور ہاف سلیو کی قمیضیں پہن رکھی ہیں۔ لیجئے سنیل گواسکر اور مہندر امرناتھ بھی گراؤنڈ میں داخل ہو رہے ہیں۔ تماشائی تالیاں بجا بجا کر استقبال کر رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی اور پاکستان کی طرف سے بالنگ کریں گے عمران خان۔ ناظرین جیسا کہ آپ جانتے ہیں عمران خان نوجوان کھلاڑی ہیں اور یہ بڑی طاقت سے بال پھینکتے ہیں۔ اُدھر سنیل گواسکر کو پانچ کھلاڑیوں نے گھیرے میں لے لیا ہے۔ غالباً مشتاق یہ چاہتے ہیں کہ گواسکر کو شروع ہی میں نروس کر دیا جائے اور اس طرح بھارت کو فوری طور پہ پہلے صدمے سے دو چار کر دیا جائے۔ عمران خان اپنے سٹارٹ لینے کی جگہ پہ پہنچ گئے ہیں۔ وہ بڑا لمبا سٹارٹ لیتے ہیں۔ لیجئے انہوں نے اپنا سویٹر اتار دیا ہے۔ شاید قمیض بھی اتارنے لگے ہیں اور پھر شاید..... لیکن نہیں انہوں نے صرف اُوپر کے دو بٹن کھولے ہیں جس سے ان کے گلے میں بڑا خوبصورت لاکٹ اور بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ لیجئے انہوں نے سٹارٹ لے لیا ہے وہ بڑی تیزی

سے دوڑ رہے ہیں۔ (بڑی تیز آواز میں) انہوں نے پہلا بال پھینکا۔ گواسکر نے زوردار ہٹ لگائی اور بال باونڈری لائن کراس کر گیا ہے۔ چوکا۔ بڑا خوبصورت چوکا۔ تماشائی بھی کھل کر داد دے رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی میں مائیک دیتی ہوں محترمہ عفت آرا کو کہ وہ اس چوکے پر اپنی ماہرانہ رائے کا اظہار کریں:"

محترمہ عفت آرا:۔" (بڑے ٹھہرے ٹھہرے انداز میں رک رک کر) جی ہاں پروین تم نے ٹھیک کہا یہ چوکا ہے اور میں سمجھتی ہوں یہ بہت خوبصورت چوکا ہے اور اس کے ساتھ ہی بھارت کا مجموعی سکور ہو گیا ہے چار۔ عمران کو چاہیئے تھا کہ وہ بال کو تھوڑا اور آگے پھینکتا۔ میں نے کئی میچوں میں نوٹ کیا ہے کہ اس طرح کی ہٹ چھکا بھی ہو سکتی ہے اور میرے خیال میں یہاں اگر سلیم شیروانی ہوتا تو یہ ضرور چھکا ہوتا...."

پروین رحمان:" لیکن محترمہ عفت آرا۔ سلیم شیروانی تو کرکٹ کا نہیں بلکہ ہاکی کا کھلاڑی ہے۔"

محترمہ عفت آرا:" ہاں ہاں تم نے ٹھیک کہا ہے پروین۔ میں دراصل حنیف کو سلیم شیروانی سے کنفیوژ کر رہی تھی۔ پروین۔ دراصل حنیف نے ایک ایسے ہی بال پر ۱۹۵۵ء میں امرتسر میں چھکا لگایا تھا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ یہ میچ دیکھنے بائی روڈ گئی تھی۔ میرا بڑا لڑکا امتیاز اس وقت دس سال کا تھا...."

پروین رحمان:" تو ناظرین یہ تھی محترمہ عفت آرا کی پہلے چوکے پر ماہرانہ رائے۔ عمران خان پھر سٹارٹ لے رہے ہیں۔ انہوں نے بال پھینکا لیکن گواسکر نے بال کو ٹچ نہیں کیا اور اسے جانے دیا وکٹ کیپر وسیم باری کے ہاتھ میں۔ وسیم باری نے بال پھینکا ماجد خان کی طرف۔ وہ بال کو غور سے دیکھ رہے ہیں (جیسے پہلی بار دیکھا ہو) وہ اب بال کو اپنی پتلون پر رگڑ رہے ہیں۔ انہوں نے بال دیا مشتاق کو۔ مشتاق نے بھی بال کو اپنی پتلون پر رگڑا اور اسے پھینکا ظہیر عباس کی طرف۔ ظہیر عباس نے بال کو اپنی پتلون

چکھائی اور اسے پھینک دیا ہے عمران خان کی طرف۔ عمران خان بال کو غور سے دیکھ رہے ہیں لیجئے انہوں نے بھی بال کو اپنی پتلون کے آگے کی طرف رگڑنا شروع کر دیا ہے۔ وہ بال کو مسلسل رگڑے جا رہے ہیں۔ شمائلہ تم نے پہلے دو میچوں میں نوٹ کیا تھا کہ عمران خان بال کو آگے کی طرف سے رگڑتے ہیں جبکہ سرفراز نواز اور سکندر بخت پیچھے کی طرف سے؟"

شمائلہ اشرف "ہاں پروین میں نے بھی یہ بات نوٹ کی تھی لیکن ہر کھلاڑی کا اپنا اپنا سٹائل ہوتا ہے اور اپنی اپنی پسند۔ لیکن دونوں صورتوں میں مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔"

پروین رحمان "یعنی؟"

شمائلہ اشرف "یعنی۔ بال کو شائن کرنا تاکہ وہ سونگ کر سکے لیکن عمران خان بال کو کچھ زیادہ ہی رگڑتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہمیں اس سلسلے میں محترمہ عفت آرا کی ماہرانہ رائے لینا چاہیئے۔

پروین رحمان "ہاں ہاں ضرور محترمہ عفت آرا کیا آپ کچھ فرمائیں گی کہ یہ جو کھلاڑیوں کو بال رگڑنے کی عادت ہوتی ہے اس سے کیا ان کی بالنگ کی تیزی یا خطرناکی میں کوئی فرق پڑتا ہے؟"

محترمہ عفت آرا "شکریہ پروین۔ بال کو رگڑنے سے ضرور فرق پڑتا ہے اور اس سے بال میں چمک اور تیزی آجاتی ہے۔ باقی رہا یہ مسئلہ کہ بال کو آگے اور پیچھے رگڑنے سے بال کی پوزیشن یا خود صاحب بال کی کارکردگی پہ کیا اثر پڑتا ہے۔ میں اس موضوع پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ میرے شوہر کو جو کہ آپ جانتی ہیں ایک اچھے ڈاکٹر ہیں بال رگڑنے کے خلاف تو نہیں البتہ بال کو بار بار تھوک لگانے کے بہت خلاف ہیں جیسا کہ بعض باؤلر اور خاص طور پہ بھارتی ٹیم کے کپتان بشن سنگھ بیدی کرتا ہے۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ اس طرح ایک باؤلر کے جراثیم دوسرے باؤلر میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ایک ملک کے باؤلروں کے بعد جب وہی بال دوسرے ملک کے باؤلر استعمال کرتے ہیں تو اس طرح جراثیم ایک ملک سے دوسرے ملک میں بھی (بغیر پاسپورٹ کے) چلے جاتے ہیں۔ میرے شوہر نے ماہنامہ

"کرکٹ" میں اس موضوع پر ایک مضمون بھی لکھا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ .....

پروین رحمان: "شکریہ محترمہ عفت آرا - تو ناظرین یہ تھی ماہرانہ رائے محترمہ عفت آرا کی ....."

پروین رحمان: "ناظرین کھیل شروع ہوئے دو گھنٹے گزر چکے ہیں اور بھارت کے کھلاڑی آؤٹ ہو چکے ہیں تین - جیسا کہ آپ نے دیکھا دو وکٹیں لیں عمران خان نے اور ایک سرفراز نے - اور اب بھارت کی طرف سے چیتن چوہان کھیلیں گے اور پاکستان کی طرف سے بالنگ کرائیں گے مشتاق محمد - یہ ان کا پہلا اوور ہے اور دیکھتے ہیں وکٹ ان کا ساتھ دیتی ہے یا نہیں - مشتاق بڑے اچھے سپنر ہیں لیکن میرے خیال میں یہ وکٹ سپنرز کے حق میں اچھی نہ ہوگی وہ فیلڈنگ کو از سرِ نو ترتیب دے رہے ہیں - ظہیر عباس کے پاؤں میں موچ آگئی تھی یا جیسا کہ ہمارے مبصر کا خیال ہے ان کی نظر کی عینک کا ایک شیشہ ٹوٹ گیا تھا - بہرحال اب ان کی جگہ بارھویں کھلاڑی وسیم راجہ کھیل رہے ہیں - مشتاق نے اپنے اوور کا پہلا بال پھینکا اور کوئی سکور نہیں ہوا - بھارت چوسٹھ اور تین کھلاڑی آؤٹ - کھیل پر مشتاق محمد کی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی ہے اور میں سمجھتی ہوں پہلا میچ جیتنے کا سہرا بھی مشتاق محمد ہی کے سر ہے - اس وقت وہ دنیا کے کامیاب ترین کپتانوں میں شمار ہوتے ہیں وہ اب پھر جا رہے ہیں چوہان کی طرف - پہلے اوور کا دوسرا بال - ناظرین چوہا - چوہا - ہائے میں مر گئی - (ٹی وی بوتھ میں بھگدڑ سی مچ جاتی ہے اور تینوں خواتین کی طرح طرح کی آوازوں اور چیخوں کا براہ راست قذافی سٹیڈیم سے قومی نشریاتی رابطہ پر ٹیلی کاسٹ ___ لیکن کیمرے کا فوکس گراؤنڈ ہی پر رہتا ہے) کہاں ہے؟ کہاں ہے؟ وہ - وہ - یہ - یہ تمہاری شلوار کے پاس - ہائے اللہ - اُوئی - پکڑو - پکڑو - توبہ - یہ کیا مصیبت ہے - (چوہے کو جوتا مارنے کی پس منظر سے آواز) - ہائے میں مر گئی - ہم کیا کریں سب مصیبتیں ہمارے ہی لئے ہیں -

ٹی وی کی سکرین پر "انتظار فرمائیے" کا اعلان نمودار ہوتا ہے ۔۔۔ تقریباً دو منٹ بعد اناؤنسر صاحبہ تشریف لاتی ہیں۔ (وہ زیرِ لب مسکراتی ہیں لیکن ساتھ ساتھ پیشہ وارانہ سنجیدگی بھی ہے)

"ناظرین۔ ہم معذرت خواہ ہیں کہ قذافی سٹیڈیم میں ٹی وی کے بوتھ پر اچانک ایک بڑے سے چوہے کے آ جانے سے ہماری کیمنٹیٹرز اور مبصر کچھ گھبرا سی گئی تھیں اور اس طرح ہمیں کھیل دکھانے کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے روکنا پڑا۔ ابھی ابھی ہمیں قذافی سٹیڈیم سے اطلاع ملی ہے کہ چوہا ٹی وی بوتھ سے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو چکا ہے اور ہم نے اب ایسے خصوصی انتظام کر لئے ہیں کہ یہ چوہا یا اس طرح کوئی دوسرا چوہا ٹی وی بوتھ کی طرف نہ آئے لہٰذا ہم آپ کو پھر قذافی سٹیڈیم لئے چلتے ہیں جہاں بھارت اور پاکستان کے درمیان کرکٹ میچوں کی موجودہ سیریز کا تیسرا میچ ہو رہا ہے تو آیئے ناظرین۔ قذافی سٹیڈیم" کیمرہ ٹی وی بوتھ پر تینوں خواتین کو دکھاتا ہے جو ہراساں ہراساں اور پریشاں پریشاں سی نظر آتی ہیں۔

پروین رحمان: "ناظرین ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں کہ کچھ دیر کے لئے ہمارا رابطہ آپ سے ٹوٹ گیا تھا۔ جیسا کہ آپ کو بتایا جا چکا ہے کہ یہاں اچانک ایک خطرناک چوہا آ گیا تھا۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ کسی تماشائی کی شرارت تھی۔ اس لئے کہ عام طور پر چوہے کا خود بخود یہاں چلے آنا ممکن نہ تھا۔ بہرحال ہم اس بارے میں اپنی مبصر محترمہ عفت آرا سے پوچھتے ہیں کہ چوہے کے یہاں چلے آنے کے بارے میں ان کی ماہرانہ رائے کیا ہے اور کیا کرکٹ کی تاریخ میں پہلے بھی کوئی اس طرح کا واقعہ پیش آیا ہے۔"

محترمہ عفت آرا: "شکریہ پروین۔ مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے کہ یہ چوہا تھا۔ البتہ میرے لئے فی الحال یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ خود بخود یہاں چلا آیا تھا یا یہ کسی تماشائی کی شرارت تھی۔ البتہ میرے شوہر نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ چوہوں میں بھی بعض انسانی خصوصیات ہوتی ہیں۔ بعض چوہے خود کھیل کود پسند کرتے ہیں اور بعض دوسروں کو کھیلتا کودتا دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ میرے شوہر کے خیالات کی روشنی میں ہو سکتا ہے کہ یہ چوہا خود اپنے

طور پر ہی کرکٹ میچ دیکھنے آگیا ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں آج سے پہلے ہونے والے میچ بھی دیکھ چکا ہو۔

پروین رحمان :" شکریہ محترمہ عفت آرا۔ تو ناظرین یہ تھی محترمہ عفت آرا کی ماہرانہ رائے یا آپ کہہ سکتے ہیں ان کے شوہر کی رائے۔ ناظرین اب یہاں صورت حال یہ ہے کہ بھارت کے چار کھلاڑی آؤٹ ہو چکے ہیں اور بھارت کا اپنی پہلی اننگز میں ابھی تک سکور ہے ایک سو سات۔ اب بالنگ کر رہے ہیں سکندر بخت۔ سکندر بخت نوجوان کھلاڑی ہیں اور یہ میڈیم فاسٹ باؤلر ہیں۔ سکندر بخت بالنگ کریں گے کپل دیو کو۔"

پروین رحمان :" ناظرین۔ چائے کے وقفہ کے بعد کھیل دوبارہ شروع ہوا چاہتا ہے اب تک بھارت ایک سو بہتر رنز بنا چکا ہے اور اس کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو چکے ہیں آخری آؤٹ ہونے والے کھلاڑی گائیکواڑ ہیں۔ آج آؤٹ ہونے والے کھلاڑیوں میں سے دو کھلاڑی آؤٹ کیے عمران خان نے، جبکہ سرفراز نواز، مشتاق محمد اور سکندر بخت نے ایک ایک وکٹ لی۔ آؤٹ ہونے والے کھلاڑیوں میں سب سے زیادہ رنز لیے ہیں چیتن چوہان نے۔ وہ اگر دو رنز اور لے لیتے تو ان کی ہاف سینچری ہو جاتی۔ بہرحال وہ بڑا اچھا کھیلے اور ان کی اڑتالیس رنز میں پانچ چوکے بھی شامل ہیں میرا خیال ہے....

شمائلہ اشرف (غصے میں اور تیزی سے تقریباً چیختی ہوئی) پروین۔ میں بھی صبح آٹھ بجے سے یہاں کمنٹری باکس میں بیٹھی ہوئی ہوں۔ تم میں اتنی بھی کرٹسی Courtesy نہیں کہ مجھے بھی ایک دفعہ ہی کمنٹری کے لئے کہا ہوتا۔ خود غرضی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ تم کوئی مجھ سے زیادہ تو نہیں بول سکتی اور جس طرح کی تم کمنٹری بول رہی ہو ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔

محترمہ عفت آرا :(سمجھانے کے انداز میں) بیٹی۔ یوں صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے پروین آج بول رہی ہے تو تم کل بول لینا۔ اب میں بھی تو صبح سے خاموش بیٹھی ہوئی ہوں۔

میرے شوہر.....

شمائلہ اشرف (مزید غصے میں۔ محترمہ عفت آرا سے مخاطب ہوتے ہوئے) آپ کو تو ہر وقت اپنے شوہر کی پڑی رہتی ہے۔ یہ اگر ایم ڈی کی چہیتی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں.....

پروین رحمان (ڈانٹنے کے انداز میں) شمائلہ میں بھی جانتی ہوں کہ تم وزیر اطلاعات.......

اچانک ٹی وی کی سکرین پر پھر "انتظار فرمایئے" کا اعلان اُبھرتا ہے۔

اس کے باوجود بلکہ انہی وجوہات کی بنا پہ ہمارا ووٹ زنانہ کرکٹ کمنٹری کے حق میں ہے۔

اورہاکی کمنٹری

جس طرح کرکٹ بہت ترقی یافتہ کھیل ہے اسی طرح کرکٹ کمنٹری کا فن یعنی کرکٹ پر رواں تبصرہ بھی ترقی یافتہ ہو چکا ہے اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کی طرح کرکٹ کی کمنٹری کرنے والے بھی معاشرے میں یا کم از کم کرکٹ میں دلچسپی لینے والے وسیع حلقوں میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں لیکن ہاکی کا معاملہ بدقسمتی سے قدرے مختلف ہے۔ گو پاکستان ہاکی کا ورلڈ چیمپیئن ہے اور اب سینئر کھلاڑیوں کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ہماری جونیئر ٹیم نے بھی دنیا کی جونیئر ٹیموں کے چھکے چھڑانے شروع کر دیئے ہیں۔ لیکن ہاکی کے میچوں پر رواں تبصرہ کرنے والے ابھی وہ روانی اور پختگی حاصل نہیں کر سکے جو اس اہم بین الاقوامی کھیل کے شایان شان ہو۔ ہمارے کھلاڑیوں کی مہارت۔ تکنیک اور حزب اختلاف پر جارحانہ حملے ایک کلاسک حیثیت اختیار کر چکے ہیں جبکہ ان کھلاڑیوں کے کھیل پر کمنٹری زیادہ تر علامتی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہاکی کے رواں تبصرے کی روانی اس لئے بھی متاثر ہوتی ہے کہ ہاکی اس قدر تیز کھیل ہے کہ تبصرہ کرنے والے کے لئے بجلی کی سی

تیزی سے دوڑتی بال کے ساتھ ساتھ دوڑنا یعنی بولنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً جب کمنٹری کرنے والا کہتا ہے "اب بال ہے شہناز کے پاس...." تو دراصل بال شہناز سے اصلاح اصلاح سے رشید اور رشید سے مخالف ٹیم کے کسی کھلاڑی کے پاس جا چکی ہوتی ہے۔ ہاکی اس قدر تیز گیم ہے کہ اس گیم میں کئی دفعہ پہلے ہی منٹ میں گول ہو جاتا ہے۔ بہرحال ہاکی کمنٹری کو کرکٹ کمنٹری پر اس لئے برتری حاصل ہے کہ اس کمنٹری میں جس قدر دلچسپ فقرات سننے میں آتے ہیں وہ کرکٹ کمنٹری میں کہاں؟ دراصل کرکٹ کمنٹری پر ہاکی کمنٹری کی یہ برتری ہی ہمارا آج کا اصل موضوع ہے جس پر ہم مختصر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔ ذیل میں ہم اپریل ۱۹۷۹ء میں پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان آسٹریلیا کے شہر پرتھ میں ہونے والے بین الاقوامی ٹورنامنٹ کے دوران کھیل کی رواں کمنٹری کے کچھ اقتباسات پیش کر رہے ہیں۔ ان اقتباسات میں ہمارے قارئین بلکہ ناظرین دو باتیں خاص طور پر پیش نظر رکھیں۔

ا۔ رواں تبصرہ بولنے والے بعض اوقات کس طرح بڑی معصومیت کے ساتھ ذومعنی بلکہ سہ معنی فقرات کہہ جاتے ہیں اور

ب۔ پاکستان جب ہار رہا ہوتا ہے تو اس وقت کمنٹری کرنے والے کا لب و لہجہ کیا ہوتا ہے اور جب ہمارے کھلاڑی نیوزی لینڈ پر برتری حاصل کرتے ہیں تو پھر تبصرہ کرنے والے اپنا انداز کس تیزی سے بدل لیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

ناظرین۔ پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان پرتھ میں سیمی فائنل شروع ہو چکا ہے۔ درمیان میں بُلی ہوئی اور گیند چھین لی ہے حسن سردار نے۔ حسن سردار نئے کھلاڑی ہیں۔ وہ گیند لے کر آگے بڑھے اور نیوزی لینڈ کی ڈی کے قریب فری ہٹ ملی پاکستان کو۔ فاؤل ہوا شفیق کا۔ اب بال ہے مارک برٹ کے پاس اور اختر رسول نے ڈاج کیا پاکستان کو۔ بڑا خوبصورت ڈاج لیکن درمیان میں آگئے حنیف۔ حنیف۔ بال اب بھی حنیف کے پاس ہے۔

اور انہوں نے دی کلیم اللہ کو۔ لیکن انٹر سیپٹ کیا پارکن نے (ذرا بلند آواز سے) حسن سردار کی ٹرائی لیکن ناظرین ناکام رہے۔ بڑی خوبصورت ٹرائی۔

ناظرین میچ شروع ہوئے دس منٹ گزر چکے ہیں ابھی تک کوئی ٹیم گول نہیں کر سکی لیکن نیوزی لینڈ کی ٹیم بہتر کھیل پیش کر رہی ہے۔ پاکستان کے کھلاڑی ابھی اپنی فارم میں نہیں آسکے اور بال ہے نیوزی لینڈ کے کپتان کے پاس —— ٹوینٹی فائیو گز کی لائن کو عبور —— پھر عبور اور انہوں نے پاس دیا ٹونی کو —— اب گیند ہے کلیم اللہ کے پاس پاکستان کے —— کیرڈ ہوا۔ منور الزماں کی ہٹ سیدھی حنیف کے پاس —— گیند بہت تیز تھی باہر چلی گئی —— نیوزی لینڈ کی ہٹ اور بال ہے پاکستان کی ڈی میں۔ پاکستان پر نیوزی لینڈ کا حملہ اور گول۔ پاکستان کو گول کر دیا نیوزی لینڈ نے —— نیوزی لینڈ ایک، پاکستان صفر۔ بارہویں منٹ میں پہلا گول —— ناظرین آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ پاکستان اور نیوزی لینڈ کے درمیان یہ مقابلہ آسٹروٹرف پر ہو رہا ہے اور پاکستانی کھلاڑیوں کو آسٹروٹرف پر کھیلنے کا تجربہ نہیں۔ پاکستانی کھلاڑی بڑی مشکل محسوس کر رہے ہیں —— نیوزی لینڈ ایک پاکستان صفر۔

ناظرین میچ شروع ہوئے بیس منٹ گزر چکے ہیں اور بال ہے پال کے پاس —— پال سے جیف گیلس۔ پاکستان کو ڈاج کیا لیکن صفدر عباس کی ابسٹرکشن۔ جان کرسٹن کی ہٹ، گیند بہت تیز تھی اور جانے دیا باہر حسن سردار نے —— نیوزی لینڈ کی ہٹ، صفدر عباس بڑی تیزی سے آگے بڑھے اور شاید انہیں چوٹ لگ گئی ہے نیوزی لینڈ کے کھلاڑی کو۔ ہاں نیوزی لینڈ کے کھلاڑی کو چوٹ لگ گئی ہے۔ صفدر عباس کی چوٹ نیوزی لینڈ کے کھلاڑی کو، بڑی خوبصورت چوٹ اور ایمپائر نے گرین کارڈ دکھایا صفدر عباس کو۔ کھیل پھر شروع ہو چکا ہے۔ شفیق پُش کر رہے ہیں —— حنیف —— اور پاکستان کو

ایک اور پنلیٹی کارنر۔ ناظرین دیکھیں کہ آیا پاکستان اس پنلیٹی کارنر سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے یا نہیں۔ ہٹ لگائیں گے اختر رسول — اور — نیوزی لینڈ کا خوبصورت دفاع۔ پاکستان اس پنلیٹی کارنر سے فائدہ نہیں اٹھاسکا۔ اور نیوزی لینڈ کا دباؤ پاکستان پر — سمیع اللہ سے بارکن، بارکن سے مارک برٹ کی ہٹ اور پاکستان پر مزید دباؤ — اور پاکستان کے خلاف ایک اور گول — نیوزی لینڈ دو پاکستان صفر — نیوزی لینڈ کو پاکستان پر دو گولوں کی برتری حاصل ہے — پاکستان کے کھلاڑی آج صبح ہی سے نروس ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان سیمی فائنل میں ہار گیا تو پھر فائنل میں نہ جاسکے گا۔ پاکستان کسی پنلیٹی کارنر سے بھی فائدہ نہیں اٹھاسکا۔ ناظرین آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ تماشائی بار بار آوازیں بلند کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں ایمپائروں کے فیصلوں پر شدید اعتراض ہے۔ ناظرین آپ کو یاد ہوگا کہ یہ دونوں ایمپائر وہی ہیں جن پر ۱۹۷۵ء میں کھیلے جانے والے میچوں پر بھی اعتراضات کیے گئے تھے۔

ناظرین۔ آسٹریلیا کے شہر پرتھ میں نیوزی لینڈ اور پاکستان کے درمیان سیمی فائنل میچ کا دوسرا ہاف شروع ہو چکا ہے۔ منور الزمان — منور الزمان — رشید الحسن — اختر رسول اور ہالین کی ابسٹرکشن نیوزی لینڈ کی ڈی کے پاس۔ پاکستان کی ہٹ۔ حنیف۔ صفدر عباس اور (بلند آواز میں) گول کر دیا پاکستان نے نیوزی لینڈ کے خلاف۔ نہایت شاندار اور سنسنی خیز گول — نیوزی لینڈ دو پاکستان ایک — ٹلی ہوئی — شفیق — منور الزمان — منور الزماں سے کلیم اللہ — لیکن انٹر سیپٹ کیا جیف نے — پاکستان نیوزی لینڈ پر اپنا دباؤ ڈال رہا ہے — صفدر عباس کی ایک اور ٹرائی اور (بہت بلند آواز میں) ایک اور گول۔ پاکستان نے نیوزی لینڈ کے خلاف دوسرا گول کر دیا۔ نہایت شاندار گول — پاکستانی ٹیم کا جارحانہ حملہ — پاکستان دو۔ نیوزی لینڈ دو۔ ناظرین آپ جانتے ہیں کہ صفدر عباس نیا کھلاڑی ہے اور اس نے یہ گول کر کے ثابت کر دیا ہے کہ اس کی ٹیم میں شمولیت

کوئی غلط فیصلہ نہ تھا — بال پھر نیوزی لینڈ کی ڈی کے پاس پہنچ چکا ہے۔ نیوزی لینڈ کے سینٹر فارورڈ نے روکا — پاکستان کے کھلاڑیوں کے حوصلے بلند ہو چکے ہیں اور وہ نیوزی لینڈ پر مزید دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ابھی تک دونوں ٹیمیں برابر ہیں۔ کھیل میں بڑی تیزی آگئی ہے۔ تقریباً سب کھلاڑی آسٹریلیا کی ڈی میں پہنچ چکے ہیں اور بال چھینا بال نے بال سے حسن سردار اور منور الزمان (اور تقریباً چھینتے ہوئے) گول — پاکستان کا ایک اور گول۔ انتہائی شاندار گول — شفیق کے پاس پر منور الزمان نے انتہائی خوبصورت گول کر دیا۔ منور الزمان کو دو کھلاڑیوں نے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے ایک کھلاڑی کو ڈاج کیا پھر دوسرے کو ڈاج کیا اور پھر پاکستان کا تیسرا گول کر دیا۔ انتہائی جارحانہ گول۔ پاکستان تین نیوزی لینڈ دو۔ پاکستان کو اب ایک گول کی برتری حاصل ہو گئی ہے۔ پاکستانی کھلاڑی دراصل اب اپنے مخصوص سٹائل میں کھیل رہے ہیں اور صبح ہی سے نیوزی لینڈ پر حاوی تھے۔ پاکستان تین — نیوزی لینڈ دو — پاکستان کو ایک گول کی برتری حاصل ہو گئی ہے

ناظرین — یہاں پرتھ میں پاکستان اور نیوزی لینڈ کی ٹیموں کے درمیان نہایت شاندار کھیل ہو رہا ہے۔ یہاں موسم نہایت خوشگوار ہے — پاکستان تین — نیوزی لینڈ دو۔ پاکستان صبح ہی سے نیوزی لینڈ پر چھایا ہوا ہے — دراصل پاکستانی کھلاڑیوں کی مہارت اور مخصوص سٹائل کے آگے کسی بھی ٹیم کا ٹھہرنا مشکل ہے — گیند کو کلیئر کیا اختر رسول نے — نیوزی لینڈ کے ٹونی — ٹونی سے جیف گیپس لیکن بال چھین لی کلیم اللہ نے — مارک برٹ کی ابسٹرکشن — اور ہٹ لگائیں گے صفدر عباس — بال مسلسل نیوزی لینڈ کے ہاف میں ہے اور اب ڈی کے قریب — لیکن یہاں نیوزی لینڈ کے بہت سے دفاعی کھلاڑی موجود ہیں — سینٹر فارورڈ نے ڈلیش کیا — بال پھر پاکستانی کھلاڑیوں کے پاس ہے — ناظرین آپ دیکھ رہے ہیں کہ تماشائیوں میں بہت جوش و خروش پیدا ہو چکا ہے — آسٹریلیا کے علاوہ یورپ کے دوسرے ممالک

کے بہت سے پاکستانی بھی یہاں آکر یہ دلچسپ میچ دیکھ رہے ہیں۔ وہ بار بار نعرہ تکبیر اور اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعرے لگا لگا کر اپنے تماشائیوں معاف کیجئے کھلاڑیوں کے حوصلے مزید بلند کر رہے ہیں اور سمیع اللہ ۔۔۔ سمیع اللہ سے حسن سردار۔ (بلند آواز میں) کلیم اللہ کی ٹرائی لیکن کامیاب نہیں ہوئے ۔۔۔ اور ایمپائر نے گرین کارڈ دکھایا نیوزی لینڈ کے کھلاڑی کو ۔۔۔ فرانس کے یہ ایمپائر خود بھی چوٹی کے ہاکی پلیئر ہیں اور ان کا شمار دنیا کے چند اعلیٰ ایمپائروں میں ہوتا ہے ۔۔۔ پاکستان کا ایک اور حملہ۔ کھیل میں بہت تیزی آچکی ہے اور (بہت ہی بلند آواز میں) گول۔ پاکستان کا نیوزی لینڈ کے خلاف چوتھا گول۔ انتہائی شاندار گول۔ پاکستان چار، نیوزی لینڈ دو۔ پاکستان کو نیوزی لینڈ کے خلاف دو گولوں کی برتری حاصل ہو گئی ہے۔ پاکستان چار، نیوزی لینڈ دو۔ پاکستانی کھلاڑیوں نے ثابت کر دیا ہے کہ آسٹرو ٹرف ہو یا کوئی اور ٹرف۔ ان کے سامنے دنیا کی کوئی ٹیم نہیں ٹھہر سکتی اور ان کی لاثانی تکنیک کا کوئی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پاکستان چار، نیوزی لینڈ دو۔ دراصل آج صبح ہی سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ پاکستان یہ مقابلہ بھی جیت جائے گا۔ پاکستان چار، نیوزی لینڈ دو........

مہنگائی اور مثبت نتائج

آپ اسے حسنِ اتفاق کا نام دے لیجئے یا کوئی اور۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ پچھلے تیس سال میں یہاں جتنے بھی سربراہ حکومت ہو گزرے ہیں ان سب کی کوئی نہ کوئی ایسی عادت، خواہش یا سوچ ضرور رہی ہے جو اصل میں ہماری امتیازی عادت، خواہش یا سوچ رہی ہے۔ مثلاً اپنے شہید بابا یعنی قائدِ عوام کی ہی مثال لیجئے۔ مرحوم کو اچھی کافی اور اچھے سگار بہت پسند تھے۔ یہ دونوں نفیس چیزیں دراصل ہمیں مرغوب رہی ہیں اور اب بھی ہیں۔ ہم دونوں میں ایک اور قدرِ مشترک بھی تھی اور وہ یہ کہ ہم دونوں بہت کم سوتے تھے لیکن بعد میں بھٹو صاحب اس میدان میں ہم سے دو چار قدم آگے نکل گئے اس لئے کہ انہیں اپنی حکومت کے آخری دو تین سال کسی کے ساتھ بھی نیند نہیں آتی تھی جبکہ اچھا ساتھ ہو تو ہمیں نیند آجاتی ہے۔ (اپنے صالح قارئین کے لئے ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ یہاں اچھے ساتھ سے ہماری مراد کوئی اچھی کتاب ہے کیونکہ کوئی اور طرح کا دنیاوی ساتھ ہو تو پھر نیند آتی نہیں اُڑ جاتی ہے)۔ ہمارے بعض کوتاہ نظر حاسد ہماری عدم موجودگی میں کہتے ہیں کہ جب کسی

سربراہ حکومت کی شخصیت کا کوئی خاص پہلو نمایاں ہوجاتا ہے اور ہمیں پسند آجاتا ہے تو ہم اسے کاپی کرلیتے ہیں اور اس طرح عوام کی توجہ اپنی طرف بھی مبذول کر لیتے ہیں لیکن جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا کر رکھی ہے وہ جانتے ہیں کہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تو ہوسکتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ خدانخواستہ ہم کسی ملکی یا غیر ملکی شخصیت کو کاپی کرتے ہیں۔

جس طرح ہم میں اور ماضی کے وزراء اعظم اور صدور صاحبان کی بعض سوچیں اور مشاغل ایک جیسے رہے ہیں اسی طرح اتفاق سے موجودہ سربراہِ حکومت کے بعض نظریات ہمارے نظریات سے ملتے ہیں۔ ماضی اور حال کے اس تجربہ کی روشنی میں اب پورے وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کے مستقبل کے حکمرانوں کے بھی افکار ہمارے ذاتی افکار سے ملتے جلتے ہوں گے۔ جہاں تک ہمارا اور موجودہ سربراہِ حکومت کا تعلق ہے اتفاق سے ہم دونوں مثبت نتائج پر بہت زور دیتے ہیں۔ ہم دونوں پوری ایمانداری سے محسوس کرتے ہیں کہ مثبت نتائج بہت ضروری چیز ہوتی ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ فلسفۂ مثبت نتائج سے ہم دونوں کا مطلب اور مفہوم ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو۔ جہاں تک اس فلسفہ سے ہمارے ذاتی مفہوم کا تعلق ہے وہ ہم ذرا آگے چل کر واضح کر دیں گے۔ لیکن یہ کہنا ہمارے ساتھ زیادتی ہوگی کہ ہم نے صدر صاحب کے دیکھا دیکھی مثبت نتائج کے سنہری اصولِ حیات کو اپنا لیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم تو ہر بات میں مثبت سوچ رکھنے اور مثبت نتائج دیکھنے کے اُس وقت سے قائل ہیں جب کئی برس پہلے ہم نے ذاتی اور ملکی مسائل اور ان کے حل کے متعلق سوچنا شروع کیا تھا۔ ممکن ہے اتفاق سے صدر صاحب بھی کئی سال پہلے مثبت نتائج پر غور و خوض کرتے رہے ہوں اگر ایسا ہے تو یہ بھی حُسنِ اتفاق ہوگا کیونکہ بڑے آدمیوں کی سوچ ایک جیسی ہوتی ہے۔ لیکن ہم حلفیہ کہتے ہیں کہ مثبت نتائج کا فلسفہ ہمارا اپنا فلسفہ ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ہم کئی دفعہ لکھ چکے ہیں کہ ہم اپنی ذاتی خوبیوں اور

خداداد صلاحیتوں کا بیان کرنا کوئی اچھا فعل نہیں سمجھتے اور یہ جو ہم نے اپنی اور صدر صاحب کے درمیان قدرِ مشترک کا مختصر سا ذکر کر دیا وہ اس لئے ضروری ہو گیا تھا کہ آج ہم جس مسئلہ پہ لکھنے لگے ہیں یعنی "ہائے مہنگائی" اس کا حل ہمارے نزدیک مثبت سوچ کے بغیر ممکن نہیں۔

جیسا کہ ماہرینِ معاشیات بتاتے ہیں مہنگائی ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ دُنیا کے تمام چھوٹے بڑے ممالک افراطِ زر اور مہنگائی جیسے مسائل سے دوچار ہیں۔ خود ہمارے ملک میں لوگ دن رات "ہائے مہنگائی" "ہائے مہنگائی" کرتے رہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک تمام حکومتیں مہنگائی کے ہمالیہ جیسے خوفناک دیو پہ قابو پانے کے لئے طرح طرح کے منصوبے تیار کرتی رہی ہیں۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ نہ ماضی میں یہ دیو قابو میں آیا اور نہ مستقبل میں اس وقت تک اس پہ قابو پایا جا سکتا ہے جب تک عام صارفین ہماری طرح مثبت سوچ کو نہیں اپنا لیتے۔ ہم اس مرحلہ پہ صارفین سے پوچھنا چاہیں گے یہ جو آپ لوگ دن رات کڑھتے رہتے ہیں اور مہنگائی مہنگائی کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں اس سے آپ کو کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ آخر آپ ہمیشہ تاریک پہلو کیوں دیکھتے ہیں؟ اب آپ کہیں گے کہ مہنگائی کے ضمن میں بھلا مثبت سوچ کیا ہو سکتی ہے قبلہ مہنگائی کے ضمن میں مثبت سوچ جو ہم ذاتی طور پہ کئی برسوں سے اپنائے ہوئے ہیں وہ یہ ہے کہ جب بھی حکومت یا خود دکاندار روزمرہ استعمال کی بعض اشیاء کی قیمت فروخت میں اضافہ کر دیتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں کہ ان اشیاء کی قیمتوں میں جو اضافہ ہوا ہے حکومت یا دکاندار اس سے دوگنا اضافہ کر دیتے تو پھر ہم کیا کرتے؟ مثلاً جس زمانہ میں پٹرول کی قیمت چھ روپے فی گیلن کے بجائے سات روپے فی گیلن کر دی گئی تھی تو ملک میں بڑی ہاہاکار مچی تھی لیکن ہم چونکہ مثبت سوچ رکھتے ہیں اس لئے ہم بڑے خوش ہوئے اور باکار دوستوں کو مبارکباد دی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ پٹرول کی قیمت میں صرف

ایک روپیہ کا اضافہ ہوا ہے اگر دو روپے کا اضافہ ہو جاتا تو پھر آپ لوگ کیا کرتے۔ یعنی معاشیات کی رُو سے چونکہ دو روپے کے بجائے صرف ایک روپیہ کا اضافہ ہوا ہے اس لئے ایک لحاظ سے آپ کی فی گیلن ایک روپیہ بچت ہو گئی اور ظاہر ہے یہ خوشی ہی کی بات ہے۔ اب ۸۰-۱۹۷۹ء کے مالی سال کے بجٹ کے موقع پر حکومت نے قومی مفاد میں سیمنٹ کی قیمت ۳۵ روپے فی بوری سے بڑھا کر ۵۵ روپے فی بوری کر دی ہم نے نوٹ کیا کہ منفی سوچ رکھنے والے صارفین اور پریس نے اس معمولی اضافے کے خلاف طوفان بپا کر دیا۔ لیکن ہم چونکہ مثبت سوچ کے حامل ہیں اس لئے آپ یقین فرمائیں کہ ہم اس معمولی اضافے سے بہت خوش ہوئے۔ ہم نے اپنے دوستوں کو اعتماد میں لے کر سمجھایا کہ اگر ملکی مفاد میں سیمنٹ کی قیمت دوگنی کر دی جاتی یعنی ۳۵ روپے سے بڑھا کر ۷۰ روپے کر دی جاتی تو آپ حضرات کیا کرتے۔ اب چونکہ قیمت ۷۰ روپے نہیں بلکہ صرف ۵۵ روپے مقرر کی گئی ہے اس لئے ایک لحاظ سے یوں سمجھنا چاہیئے کہ صارفین نے ۱۵ روپے فی بوری بچا لئے۔ ممکن ہے بعض منفی سوچ رکھنے والے حضرات کہیں کہ قبلہ اس طرزِ فکر کو مثبت سوچ نہیں بلکہ خود فریبی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ لیکن جناب ہمارے نزدیک یہی مثبت سوچ ہے اور دراصل ایسی ہی سوچ سے مثبت نتائج پیدا ہو سکتے ہیں۔ ایسی مثبت سوچ کے علاوہ مہنگائی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے نہ صرف مہنگائی کو فیس Face کرنے کے لئے یہ اصول اپنا رکھا ہے بلکہ زندگی کے ہر میدان میں مثبت سوچ ہی سے کام لیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ موجودہ حالات میں بھی ہر وقت خوش رہتے ہیں۔ کوئی دوسرے ماہر معاشیات مہنگائی کا اس سے بہتر اور عملی حل پیش کر سکیں تو ہمیں مطلع فرمائیں۔

لوگ بیس تیس سال پرانے زمانہ کو عام طور پہ سستا زمانہ کہتے ہیں۔ جب کہیں مہنگائی کی بات چلتی ہے تو لازمی طور پہ سستے زمانے کا بھی ذکر آتا ہے اور بزرگ صارفین بڑے

فخریہ انداز میں بتاتے ہیں "یہ انیس سو پچیس کی بات ہے۔ کیا سستا زمانہ تھا۔ گھر سے ایک روپیہ لے کر نکلتے تھے۔ ملازم ساتھ ہوتا تھا۔ دو تین سیر گوشت خریدتے، سیر بھی دیسی گھی بھی خرید لیتے۔ دو چار سبزیاں خریدتے اور ایک دو دالیں اور واپسی پہ بچوں کے لئے کوئی چھوٹی موٹی کھانے پینے کی چیزیں بھی لے لیتے۔ اور پھر بھی پورا روپیہ خرچ نہ ہوتا۔ دو تین آنے بچ جاتے۔" اس کے جواب میں ہم کہتے ہیں کہ آج سے بیس سال بعد ہمارے ہمعصر کہا کریں گے "یار یہ ۱۹۸۰ء کی بات ہے۔ کیا سستا زمانہ تھا۔ گھر سے سو روپے لے کر نکلتے۔ بچے کو ڈاکٹر کے پاس لے جاتے۔ صرف چوسٹھ روپے فیس دیتے۔ واپسی پر ایک دو دوائیاں خریدتے اور پھر بھی بیس سگریٹ والا ایک پیکٹ خریدنے کے لئے پیسے بچ جاتے۔ دوسرے سو روپے کے نوٹ سے گھر کے لئے ایک کلو موٹی موٹی پیاز خریدتے، ولائتی مرغی کے درجن بھر سفید سفید انڈے خریدتے، ایک بڑی ڈبل روٹی بھی لے لیتے جو خاندان بھر کے لئے کافی ہوتی اور پھر بھی بچوں کے لئے چیونگم وغیرہ خریدنے کے لئے دو چار روپے بچ ہی جاتے۔ لیکن اب؟ توبہ ہے۔ بازار میں ایک ہزار روپے لے کر جائیں تو دکاندار کہتا ہے پرے ہٹو کیا خالی جیب لئے چلے آرہے ہو۔" اس لئے صارفین کرام آپ سنہ ۱۹۸۰ء کا مقابلہ و موازنہ سنہ ۲۰۱۵ء سے کریں اور پھر دیکھیں کس طرح سے مثبت نتائج نکلتے ہیں۔ آپ یقینی طور پہ کڑھنا چھوڑ دیں گے اور یوں خوش خوش رہا کریں گے جیسے آپ کا شمار بھی پاکستان کے بائیس بڑے صنعتی و کاروباری خاندانوں میں ہوتا ہے جو کہ اب دراصل بائیس نہیں ہمارے سمیت تئیس ہو چکے ہیں۔

ہم چونکہ خود ماہر معاشیات ہیں اس لئے ہماری تھیوری یہ ہے کہ سستا زمانہ دراصل اشیاء کی ناقدری کا زمانہ ہوتا ہے اور یہ صورت حال ملک کی معاشی صحت کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ کوئی ملک اشیاء کی ناقدری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مثلاً ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے بچپن میں جب کہ سستا زمانہ تھا اشیاء کی ناقدری کا یہ عالم تھا کہ ہم ٹوتھ پیسٹ

کی ایک بڑی ٹیوب ایک منٹ میں خالی کر دیتے تھے وہ یوں کہ ٹیوب کو دبانے سے جب سفید سفید، گول گول اور لمبی لمبی سی پیسٹ کا ایک سلسلہ ٹیوب سے باہر نکلنا شروع ہوتا تو ہمیں یہ منظر بڑا اچھا لگتا۔ چنانچہ ہم ایک ماہر حلوائی کی طرح زمین پر ٹوتھ پیسٹ کی پوری ٹیوب سے جلیبیاں بنا ڈالتے اور سرخ رنگ کی عام جلیبیوں کے برعکس یہ سفید رنگ کی جلیبیاں دیکھ کر اپنی ایجاد پہ خوش ہوتے۔ ہمیں یاد ہے کہ اگر خاندان کے کسی بڑے نے ٹوکا بھی اور کہا کہ بیٹے ٹوتھ پیسٹ یوں ضائع نہیں کرتے تو کسی دوسرے شفیق بزرگ نے کہہ دیا "کوئی بات نہیں۔ بچہ ہے۔ آخر جلیبیاں ہی تو بنا رہا ہے۔ اس طرح کھیل کھیل ہی میں بچے کے ہاتھ میں ہنر آ جائے گا۔ لا دو اندر سے ایک اور ٹیوب۔" اور اس طرح ہم اپنی حلوائی گیری کا شوق پورا کرتے رہتے۔ اور اب؟ اب حقیقت یہ ہے کہ رات کو سوتے وقت جب ہم اپنے دانت صاف کرنے کے لئے باتھ روم میں جاتے ہیں تو اکثر ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوب کا ڈھکنا کھولے بغیر ہی ٹوتھ برش کو ڈھکنے کے آس پاس لگے پیسٹ کے ایٹمی ذرات پہ رگڑتے ہیں اور اس طرح ٹوتھ پیسٹ کے جو دو چار ایٹمی ذرات برش پر منتقل ہو جاتے ہیں ان سے دانت صاف کر لیتے ہیں یا پھر کبھی کبھی ایٹمی ذرات والے برش کو فلمی ستاروں کے حسن بخش صابن لکس پر بھی بے خیالی سے رگڑ لیتے ہیں جیسے ارادہ تو نہیں تھا لیکن اچھا اب برش کے ساتھ تھوڑا سا صابن بھی لگ گیا ہے چلو کوئی بات نہیں۔ آئندہ خیال رکھیں گے۔ اور اس طرح ایک ٹیوب دو تین مہینے چلاتے ہیں۔ ادھر بیگم اور بچوں کو ہم مسلسل لیکچر دیتے رہتے ہیں کہ یہ ٹوتھ پیسٹ کی ایجاد دراصل مسلمانوں کے دانت خراب کرنے کے لئے انگریزوں کی سازش ہے۔ اس کے استعمال سے دانت اور مسوڑے اس طرح آہستہ آہستہ کمزور ہو جاتے ہیں جیسے ان کو پولیو ہو گیا ہے۔ دانت صاف، چمکدار اور مضبوط بنانے کے لئے قدرت کا بہترین عطیہ پہاڑی نمک ہے۔ ویسے بھی ہم دلیسی لوگوں کو دیسی علاج زیادہ سُوٹ Suit کرتا ہے۔ چنانچہ کئی دفعہ ہم خود بچوں کے سامنے عملی مظاہرہ کرتے ہیں

دانتوں پر نمک مل کر منہ ڈھیلا چھوڑ دیتے ہیں۔ بچے حیرانگی سے دیکھتے رہتے ہیں، کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اس مرحلہ پر اگر کوئی بچہ ذرا اونچی آواز میں بات کرے تو دوسرا ٹوکتا ہے "آہستہ بول۔ ابّو نے نمک لگایا ہوا ہے"۔ اس طرح ہم بچوں کو نمک استعمال کرنے کا سائینٹفک طریقہ اور فوائد سمجھاتے ہیں۔ پھر یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہمارے فلاں فلاں دوست اور ان کی فیملی پسے ہوئے کوئلہ اور ریت سے دانت مانجھتے ہیں لیکن ہم صحت کے معاملہ میں کنجوسی کے قائل نہیں اور پھر انسان کماتا کس لئے ہے اس لئے آپ لوگ بے شک نمک ہی سے دانت صاف کر لیا کریں۔ ہم کیوں استعمال کریں ریت اور کوئلہ۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ چونکہ بچوں پر ٹیلیویژن پر بار بار دکھائے جانے والے ٹوتھ پیسٹ کے ایسے اشتہارات کا جادو چل چکا ہے جن میں کوئی میک اپ زدہ حسینہ سمندر کے کنارے کھڑے اپنے موتیوں جیسے دانتوں کو مزید چمکاتی نظر آتی ہے اس لئے بچے مجبوراً کبھی کبھار پہاڑی نمک تو استعمال کر لیتے ہیں لیکن جب کبھی ہم جائے واردات پر نہ ہوں وہ ٹوتھ پیسٹ ہی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں اور اس طرح ہماری اور ملک کی اکانومی تباہ کرتے ہیں۔ چنانچہ معزز حاضرین! مندرجہ بالا مثال سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ آج سے بیس تیس سال پہلے کا زمانہ یعنی ہمارے بچپن کا زمانہ دراصل ٹوتھ پیسٹ کی ناقدری کا زمانہ تھا اور موجودہ دور ٹوتھ پیسٹ کیا پہاڑی نمک، پسے ہوئے کوئلے اور ریت کی قدردانی کا زمانہ ہے اس لئے ہمارے اور اگر ہمارے جیسے مثبت سوچ رکھنے والے اور ماہرین معاشیات بھی ہوں تو ان کے نزدیک موجودہ قدردانی کا زمانہ جس میں اشیائے پیداوار کا ضیاع نہیں ہوتا معاشی لحاظ سے صحت مند زمانہ ہے۔ اشیائے صرف کی ماضی میں ناقدری اور حال میں قدردانی کو ہم ایک اور تر مثال سے واضح کریں گے۔ ہم دراصل ہر بات مثال دے کر سمجھاتے ہیں اور ذاتی مثال اس لئے دیتے ہیں تاکہ اپنے گہرے مطالعہ اور وسیع تجربہ کی بنیاد پر جو بات کہیں وہ اثر دکھائے چند سال پہلے شادی بیاہ کی مختلف تقریبات میں ہم نے یہ بات بارہا نوٹ کی کہ بعض ناقدین

اور حساس طبیعت مدعوین جونہی کھانے سے فارغ ہوتے تو ایک دوسرے سے کہتے "ڈالڈا تھا میرا تو گلا پکڑا گیا ہے۔" دوسرا کہتا "میں نے تو اسی لیئے چاولوں کے بعد پانی نہیں پیا تھا۔" تیسرا کہتا "جونہی دیگ کا ڈھکنا کھلا مجھے معلوم ہو گیا تھا ڈالڈا ہے۔ صاحب دیسی گھی کی خوشبو تو سارے محلے میں پھیل جاتی ہے لیکن ڈالڈا؟ توبہ توبہ۔ بیماری کا گھر ہے۔" ہمارے نزدیک چند سال پہلے کا یہ زمانہ ڈالڈا کی ناقدری کا زمانہ تھا۔ ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہمارے ایک عزیز ایک دفعہ بناسپتی گھی کا ایک ڈبہ گھر لے آئے تھے لیکن دن کی روشنی میں نہیں بلکہ شام کے اندھیرے میں کہ لوگ کیا کہیں گے اب ڈالڈا پر آ گئے ہیں۔ برادری میں ناک کٹ جائے گی۔ اس کے برعکس اب ہم دیکھتے ہیں کہ شہر کے بارونق بازاروں میں بڑی بڑی فیشن ایبل خوشبودار بیگمات پرس کے بجائے ہاتھ میں پانچ پونڈ گھی کا ڈبہ لے کر یوں خوشی، فخر اور احساس کامیابی و کامرانی سے چلتی ہیں جیسے کوئی بہت بڑی مراد پا لی ہو اور جیسے اعلان کر رہی ہوں کہ آپ لوگ تو گھی کے لیئے ترس رہے ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ پورے پانچ پونڈ گھی کا ڈبہ لیئے جا رہے ہیں۔ یعنی ہماری تو پانچوں گھی میں ہیں۔ ؎

کوئی ہم سا ہو تو سامنے آئے

اور آس پاس سے گزرنے والے بھی اب بیگمات یا ان کے لوکٹ Low cut گریبانوں کے بجائے گھی کے ڈبے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ٹھنڈی آہ بھر کر ایک دوسرے کو کہتے ہیں "بس جی۔ آج کل سب کام سفارش سے چلتے ہیں۔" "کسی بڑے افسر کی بیوی ہو گی جو یوں سالم پانچ پونڈ کا ڈبہ لیئے جا رہی ہے۔"

بیگمات کیا خود ہماری اپنی حالت کچھ اس قسم کی ہے۔ ہم جس جنرل سٹور سے گھی خریدتے ہیں اس کے مالک سے ہم نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے ہیں اور ادھر سے جب کبھی گزرتے ہیں موصوف کی خیر خیریت پوچھ کر گزرتے ہیں۔ پھر ہر ماہ کے شروع میں جب گھی خریدنے کا ارادہ ہوتا ہے جنرل سٹور میں داخل ہوتے ہی موصوف کو مسکرا کر سلام عرض کرتے ہیں

پھر دو اڑھائی سو کا گھر کے لئے دوسرا سامان یعنی دالیں، صابن، میدہ اور سوجی وغیرہ خریدتے ہیں اور بعد میں موصوف کے قریب جاکر بڑے خوشامدانہ انداز میں کہتے ہیں ذرا ایک گھی کا ڈبہ بھی رکھوا دیں مہربانی ہوگی۔ موصوف کے چہرے کے تاثرات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ ہماری گزارش کو کوئی اچھا اور شریفانہ فعل نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی پرانے دوستانہ تعلقات کی بنیاد پر کہتے ہیں " اچھا دیکھتا ہوں۔ شاید ایک آدھ ڈبہ پڑا ہوا ہو" اور یہ کہہ کر وہ اپنی میز کے نیچے جھانکتے ہیں اور ہاتھ بڑھا کر پانچ پونڈ کا ایک ڈبہ نکالتے ہیں " راجہ سلطان صاحب کے لئے ایک ڈبہ بچا کر رکھا تھا لیکن اب آپ کو بھی نہ نہیں کر سکتے۔ اچھا آپ ہی لے جائیں" اس کے بعد اپنے ملازم کو آواز دیتے ہیں " اوئے لڑکے۔ ادھر آ۔ لپیٹ دو یہ ڈبہ کاغذ میں۔ دوسرے گاہکوں کی نظر پڑ گئی تو مصیبت آجائے گی" چنانچہ ہر ماہ اسی طرح کسی نہ کسی طرح راجہ سلطان کا گھی کا ڈبہ ہم لے آتے ہیں۔ جنرل سٹور کے مالک بڑے اچھے ہیں ہمارا بہت خیال رکھتے ہیں۔

ان ذاتی مشاہدات و تجربات کے پس منظر میں ایک ماہر معاشیات کی حیثیت سے چونکہ ہماری رائے یہ ہے کہ اشیائے صَرف کی صرف اسی وقت قدر ہوتی ہے جبکہ ان کی قیمت فروخت غیر ضروری طور پر کم نہ ہو۔ اس لئے ہم گہرے غور و خوض کے بعد حکومتِ وقت کو یہ مشورہ دینا چاہتے ہیں کہ:-

ا۔ ملک کی معیشت کو مزید مضبوط بنیادوں پر کھڑا کرنے کے لئے۔

ب۔ اشیار خورد و نوش کے غیر ضروری اور بے دریغ استعمال کو روکنے کے لئے اور

ج۔ عوام کے دلوں میں روزمرّہ استعمال کی اشیاء کی صحت مند قدر پیدا کرنے کے لئے۔

تمام اشیار خورد و نوش اور روزمرّہ استعمال کی دوسری اشیار کی قیمتیں فوری طور پر ایک آرڈیننس کے ذریعے کم از کم تین گنا بڑھا دی جائیں۔ مثلاً ہمارے خیال میں بعض

ضروری اشیاء کی قیمتیں کچھ اس طرح ہونی چاہئیں۔

آٹا - ۱۷۵ روپے ۲۰ کلو کا تھیلا

انڈے - ۵۰ روپے کلو میٹر یا لیٹر (بہرحال جو بھی انڈے گننے کے نئے بین الاقوامی اوزان ہیں)

گوشت - ۷۰ روپے کلو

سبزی - ۲۵ روپے کلو

اسی تناسب سے دوسری اشیاء کی قیمتیں بھی مقرر کی جا سکتی ہیں۔

ممکن ہے ہمارے بعض کوتاہ نظر مخالفین کہیں کہ ہم حکومت کو قیمتوں میں مزید اضافے کا مشورہ دے کر کھلم کھلا عوام دشمن رویہ اختیار کر رہے ہیں اور حکومت کو اپنا خالی خزانہ بھرنے کے لئے مثبت تجاویز دے کر حکومت کے مزید قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ صارفین کی اکثریت جن کو اللہ تعالیٰ نے بصیرت عطا کر رکھی ہے ہمارے ان کوتاہ نظر مخالفین کی باتوں میں نہیں آئیں گے۔ سوال یہ ہے کیا ہم نے ماضی میں کسی حکومت کی کبھی ناجائز تعریف کی ہے جواب کریں گے؟ اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ہم خواہ مخواہ حکومتِ وقت کی حمایت کر رہے ہیں تو مزید سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے جو کوتاہ نظر مخالفین خواہ مخواہ حکومتِ وقت کی مخالفت کرتے رہتے ہیں وہ اپنی اس منفی روش میں کس حد تک حق بجانب ہیں حکومت پر وہ یہ تنقید کس طرح اور کیونکر کر سکتے ہیں کہ حکومت مہنگائی کے ضمن میں کچھ نہیں کر رہی۔ قبلہ ہم بتلاتے ہیں کہ حکومت نے مہنگائی کے ضمن میں جو بھی وعدہ کیا وہ کس طرح پورا کیا۔ ہم ان مخالفین کی یاد دہانی کے لئے بتاتے ہیں کہ ہماری حکومت نے اب تک مہنگائی کے سلسلے میں صرف دو وعدے کئے تھے پہلا یہ کہ "ہم قیمتوں میں استحکام پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن کارروائی کریں گے۔" اب ہم پوچھتے ہیں کیا حکومت نے قیمتوں

میں استحکام پیدا نہیں کیا۔ کیا قیمتیں مستحکم اور مضبوط نہیں ہوئیں۔ آخر کس چیز کی قیمت غیر مستحکم ہو کر نیچے گر پڑی ہے؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ حکومت نے ہر چیز کی قیمت میں استحکام پیدا کر کے اپنا پہلا وعدہ پورا کر دیا ہے اور اگر کوئی کسر باقی رہ گئی ہے تو انشاءاللہ وہ بھی پوری کر دی جائے گی۔ مہنگائی کے ضمن میں حکومت جو دوسرا وعدہ کرتی رہی ہے وہ یہ تھا کہ "حکومت منافع خوروں کو روزمرّہ کی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے کی اجازت نہیں دے گی" کیا ہمارے اور حکومت کے مخالفین ثابت کر سکتے ہیں کہ حکومت نے کسی بھی منافع خور کو قیمتیں بڑھانے کی اجازت دی ہے؟ کیا ہمیں اس سلسلہ میں حکومت کی طرف سے کسی بھی منافع خور کو جاری کردہ لائسنس، پرمٹ یا این۔او۔سی NOC وغیرہ دکھایا جا سکتا ہے؟ اب اگر منافع خور اپنے طور پر ہی یعنی حکومت سے اجازت لئے بغیر خود بخود قیمتوں میں اضافہ کرتے رہیں تو گستاخی معاف، قصور حکومت کا ہے یا منافع خوروں کا؟

ہم نے یہ بھی نوٹ کیا ہے کہ ایسی منفی سوچ رکھنے والے لوگ اور حکومت پر دن رات تنقید کرنے والے حضرات یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ ملک میں چینی، گندم اور گھی وغیرہ کی گرانی اور نایابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ یہ بنیادی اشیائے ضرورت بڑے پیمانے پر سمگل کر دی جاتی ہیں اور بھارت و افغانستان کی منڈیوں میں کھلے عام بکتی ہیں ان منفی سوچ رکھنے والے حضرات کا کہنا ہے کہ ملک کو گندم اور گھی وغیرہ سے محروم کر کے ان اشیاء کو سمگل کرنا اور ان کے عوض سامانِ تعیش ملک میں جگہ جگہ کھلنے والی باڑہ مارکیٹوں میں فروخت کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ لیکن ہم اور ہم جیسے مثبت سوچ رکھنے والے محبِ وطن اِن حضرات سے پوچھیں گے کہ قبلہ گھی اور گندم کی سمگلنگ حکومت کرتی ہے یا سمگلر حضرات؟ یہ حکومت بیچ میں کیسے آگئی؟ کیا یہ سمگلر حکومت کی اجازت سے سمگلنگ کرتے ہیں؟ یعنی جب یہ کالے لوگ کالے دھندے کی نہ تو حکومت سے اجازت لیتے ہیں اور نہ حکومت ان کالے لوگوں کو کالے دھندے کی اجازت دیتی ہے

اور یہ کالے لوگ خود ہی کالا دھندا کرتے رہتے ہیں تو بھائی صاحب حکومت بچاری کیا کر سکتی ہے؟

آٹا، گھی، چینی کی طرح کوئی اور آئیٹم لے لیجئے اور آپ بالآخر اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ہر چیز کے بڑھتے ہوئے نرخوں سے بڑھتی ہوئی پریشانی سے بچنے کے لئے صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے مثبت سوچ۔ مثلاً اب گوشت ہی کو لے لیجئے خواتین صارفین گوشت کی مہنگائی کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے شہر شہر صارفین کی انجمنیں بنا رہی ہیں اور اعلان کر رہی ہیں کہ ہم قصابوں کے قصاب پن سے نمٹنے کے لئے مسلسل چار ماہ گوشت کا ناغہ کریں گی اور اس طرح قصابوں کو ہتھیار یعنی چھریاں لٹکے ڈالنے پر مجبور کر دیں گی۔ نہ بی بی نہ۔ آپ گوشت کا ناغہ نہیں کر سکتیں اور آپ کے شوہروں کو بھی گوشت کھانے اور گوشت —— ہمارا مطلب ہے گوشت لانے کا ایسا چسکہ پڑ چکا ہے کہ وہ بھی گوشت کے بغیر نہیں رہ سکتے اس لئے بی بی اس انجمن سازی سے مثبت نتائج برآمد نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا ہم ان معزز بیگمات اور دوسرے ہر جنس اور عمر کے صارفین سے اپنے ذاتی تجربہ کی روشنی میں عرض کریں گے کہ دن رات کڑھتے رہنے کے بجائے خوش رہنا سیکھئے۔ خوش رہنے ہی میں درازیِ عمر کا راز ہے۔ مثبت سوچ ہی سے مثبت نتائج نکل سکتے ہیں۔ جب بھی کسی چیز کے دام بڑھ جائیں یا حکومت قومی مفاد میں مزید ٹیکس عائد کر دے تو فوراً اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ اگر یہ دام یا ٹیکس اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتے تو پھر کیا ہوتا۔ ویسے بھی ٹوتھ پیسٹ کی جلیبیاں بنانے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اور ریت سے دانت مانجھنے کا زمانہ آپہنچا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے نام کھُلا خط

ہمارا ارادہ تو یہی تھا کہ آپ کے نام یہ خط کھلا خط نہ ہوتا بلکہ ذاتی / سیکرٹ قسم کا خط ہوتا اور ہم سیل بند لفافہ کے دائیں ہاتھ کے اوپر والے کونہ پر آپ کی ذاتی ڈاک ڈیل کرنے والے فرشتے کو نوٹ بھی لکھ دیتے کہ براہ کرم یہ ذاتی خط خود اللہ تعالیٰ ہی کھولیں۔ To be opened by God himself۔ اُس صورت میں آپ کی سیکورٹی برائے زیادہ سے زیادہ یہ احتیاط کر لیتی کہ اس خفیہ خط کو کسی آٹومیٹک مشین سے گزار کر دیکھ لیتی کہ خط میں خدانخواستہ کوئی آتشگیر مادہ تو نہیں۔ لیکن ہم اس ارادہ کے باوجود خط لکھنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ہمیں بچپن ہی میں بتایا گیا تھا کہ ہر شہری کے کاندھوں پہ دو فرشتے ہمہ وقت سوار رہتے ہیں اور ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں یہ بزرگ فوراً نوٹ کر لیتے ہیں۔ نیکی کے فرشتہ صاحب ہمارے نیک کاموں کو جو کہ کبھی کبھار ہم سے سرزد ہو جاتے ہیں تاریخ وار اپنے رجسٹر میں نوٹ فرما لیتے ہیں اور بدی کا فرشتہ ہمارے بُرے کاموں کو لمحہ بہ لمحہ اپنے رجسٹر میں نوٹ کرتا رہتا ہے۔ ظاہر ہے اوّل الذکر کے رجسٹر کا بیشتر حصہ ابھی تک خالی ہوگا جبکہ مؤخر الذکر اب تک دس بیس ہزار رجسٹر ختم کر چکے ہوں گے

ہم تو کبھی کبھی سوچتے ہیں کہ یہ دوسرے موصوف ہمارے ہر غیر صالح فعل کو نہ جانے کس طرح کھُل کر تفصیل سے لکھتے ہوں گے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک ایسا فرشتہ جو غیر صالح فعل کا اس انداز سے مفصّل بیان کرے کہ واقعہ ہُو بہُو ریکارڈ ہو جائے سعادت حسن منٹو تو ہو سکتا ہے فرشتہ نہیں ہو سکتا۔

ویسے یہاں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب روزِ قیامت ہر انسان کا ہر عُضو خود ہی بول پڑے گا کہ صاحبِ عُضو مجھ سے یہ یہ کام لیتے رہے ہیں اور میں کس طرح فلاں فلاں کام بھی بادلِ نخواستہ کرنے پر مجبور تھا اور اس طرح ہر انسان کا مکمل کچا چٹھہ کھل کر سامنے آ جائے گا، دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ تو اس صورت میں ان دو انسان سوار فرشتوں کی طرف سے اپنے اپنے الگ دفاتر کھول کر بیٹھ جانا کیا (مین پاور کے وزن پر) اینجل پاور کا ضیاع نہ ہوگا؟ ہم نے اس سوال کا جواب رحمت علی چوہدری صاحب سے پوچھا تھا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں چوہدری صاحب ہمارے عزیز دوست ہیں۔ انہوں نے فرشتوں اور جِنوں کے نوری وناری سبجیکٹس کی کافی سٹڈی کر رکھی ہے۔ وہ خود بھی گفتار اور کردار کے لحاظ سے بقول بعض دوستوں کے جِنّ اور بقول بعض دوسرے دوستوں کے فرشتہ لگتے ہیں "موت کے بعد کا منظر" انہیں زبانی یاد ہے۔ ہم اور ہمارے دوست اس طرح کے پیدا ہونے والے تمام روحانی سوالات کا جواب چوہدری صاحب سے ہی پوچھتے ہیں اور وہ ہر سوال کا اس طرح پورے وثوق اور مکمل یقین سے دوٹوک جواب دیتے ہیں جیسے آپ کے پبلک سیکریٹریٹ کے او ایس ڈی (آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی) ہوں۔ اس اینجل پاور والے سوال کے جواب میں چوہدری صاحب کا کہنا ہے کہ صرف یہ انسان سوار بے وزن فرشتے ہی شہریوں کے اعمال کا حساب کتاب نہیں رکھتے بلکہ قبر میں بھی مکمل حساب کتاب ہوتا ہے۔ بقول چوہدری صاحب کے کسی "پردے میں چلے جانے" والے یعنی وفات پا جانے والے صاحب کو ہم لوگ قبر میں اتار کر آتے ہیں تو فوراً دو

فرشتے نو وارد کے کیس کی سماعت کے لئے قبر میں پہنچ جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "بتاؤ دنیا سے کیا لائے ہو"؟ چوہدری صاحب کا کہنا ہے کہ سماعت مکمل ہونے کے بعد اگر یہ دونوں جج فرشتے متفقہ طور پر کہہ دیں کہ صاحبِ قبر اس دنیائے فانی میں خدا کا باغی یعنی خدا کے احکامات کا منکر رہا ہے تو اسی وقت ہی سے مجرم کو قبر کا عذاب ملنا شروع ہو جاتا ہے بقول رحمت علی چوہدری صاحب کے قبر کی دیواریں ستر ستر گز دور جا کر بجلی کی سی تیزی سے پھر واپس آتی ہیں اور جب آپس میں ٹکراتی ہیں تو مجرم کا سُرمہ بن جاتا ہے۔ اس کے بعد مجرم کو پھر زندہ کیا جاتا ہے اور قبر کی دیواریں پھر اپنا عمل دہراتی ہیں اور اس طرح خدا کا یہ باغی قیامت تک یوں ہی پستا رہتا ہے اور سرمہ بنتا رہتا ہے۔ ہم نے چوہدری صاحب سے جو ضمنی سوال پوچھا وہ یہ تھا کہ قبلہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ایسے باغی کے ساتھ والی چند قبریں ہم جیسے فرماں بردار صالح نوجوانوں کی ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب باغی کی قبر کی دیواریں ستر ستر گز دُور ہٹ کر آپس میں قیامت تک ٹکراتی رہیں گی تو ہماری صالح قبریں بھی گنہگار قبر کے مدار میں گھومتی رہیں گی۔ آخر ہم جیسے شرفا کا قصور کیا ہوگا کہ مَر کے بھی چین نہ پائیں گے؟ چوہدری صاحب کا کہنا ہے کہ نہیں۔ نہیں آپ لوگوں کی قبریں اپنی اپنی جگہ پر موجود رہیں گی۔ بس گنہگار کی قبر ہی تیزی سے پھیلتی اور سکڑتی رہے گی۔ لیکن خدا کی قدرت سے آس پاس کے شرفاء کی قبریں محفوظ رہیں گی۔ البتہ گنہگار قبر حرکت میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے پوچھے گی کہ میرے لئے کیا حکم ہے؟ کون کون سی ہمسایہ قبر کو لپیٹ میں لینا ہے؟ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی دوسری قبر کی طرف اشارہ کر دیا تو وہ قبر بھی متاثر ہو جائے گی ورنہ قبرستان کے دوسرے مکین اپنے اپنے تہہ خانوں میں یوں مزے سے لیٹے رہیں گے جیسے ننانوے سال کی لیز پر لے رکھے ہوں۔ بقول چوہدری صاحب کے قبر ایکشن لینے سے پہلے اس لئے اللہ تعالیٰ سے پوچھے گی کہ بتا تیری رضا کیا ہے کیونکہ دنیا میں ہر چیز حرکت میں آنے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہے،

مثلاً اگر ہم چائے بنانے کی غرض سے پانی بھری کیتلی چولہے پر چڑھائیں تو پانی اللہ تعالیٰ سے پوچھے گا کہ "اے مالکِ دو جہاں۔ میرے لئے کیا حکم ہے"؟ جب حکم ہوگا "جا گرم ہو جا" تو پانی گرم ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور اگر پانی کو گرم نہ ہونے کا حکم ہو تو وہ ٹھنڈا ہی رہے گا خواہ پانی کے نیچے آگ کا درجہ حرارت ڈیڑھ دو سو سینٹی گریڈ تک جا پہنچے۔

چنانچہ چوہدری صاحب کا کہنا ہے کہ کاندھوں پر سوار بے وزن فرشتوں کا انسان کی تمام کرتوتوں کا حساب کتاب رکھنا، روزِ قیامت انسان کے اعضاء کا خود بخود بول اُٹھنا، اور قبر میں جج فرشتوں کی طرف سے سرسری سماعت وغیرہ کا عمل بظاہر انجل پاور کا نقصان اور ڈپلیکیشن آف ورک Duplicationofwork لگتا ہے۔ لیکن چونکہ نیک انسان کو داخلِ جنت کرنے اور گنہگار کو سپردِ دوزخ کرنے سے پہلے ہی جزا اور سزا کا عمل شروع ہو جاتا ہے اس لئے ہر ہر مرحلہ پر جزا اور سزا سے پہلے نئے سرے سے اور نئے نئے اینگلز Angles سے نیکیوں اور بدیوں کا حساب کتاب کیا جاتا ہے تاکہ کسی بھی فردی کو شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ رہے اور انصاف کے اعلیٰ تقاضے پورے ہوتے رہیں۔ اب اے غفور الرحیم اللہ تعالیٰ۔ آپ کے بی ہاف Behalf پر قبلہ چوہدری صاحب ہمارے مختلف سوالات کے جو اس طرح کے جوابات دیتے ہیں وہ اگر مبنی بر حقیقت ہوتے ہیں تو انہیں جزائے خیر دے اور اگر وہ حقائق کو توڑ موڑ کر پیش کرتے ہیں تو انہیں معاف فرما دے۔ ان کا پتہ یہ ہے۔ رحمت علی چوہدری۔ کاشانۂ رحمت ۔ ۱۰ لون ایونیو۔ مسلم ٹاؤن لاہور۔

توبہ۔ توبہ۔ استغفار۔ ہم نے بات کہاں سے شروع کی تھی اور کہاں چلی گئی۔ شاید شیطان مردود ہمیں بہکا رہا ہے۔ دراصل ہم میں یہ بھی ایک بشری کمزوری ہے کہ طبیعت میں یکسوئی اور مستقل مزاجی نہیں رہتی۔ توجہ انتشار کا شکار ہو ہو جاتی ہے بہرحال اے پروردگار ہمیں معاف فرما۔ ہم تو سراسر صرف اس بات کا ذکر کرنا چاہتے

تھے کہ چونکہ انسان سوار بے وزن فرشتے آپ کے نام لکھا جانے والا ہمارا یہ خط حسب عادت پڑھ لیں گے اور آپ کے نام اس ذاتی خط کے مندرجات خفیہ نہیں رہ سکتے۔ اس لئے ہم مجبوراً کھلا خط لکھنے لگے ہیں۔ ہاں تو سب سے پہلے ہم آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ نے آج تک ہماری تمام دعائیں قبول نہیں کیں۔ اب ہم بڑھاپے میں سوچتے ہیں کہ اگر زندگی میں ہماری تمام دعائیں قبول ہو جاتیں تو آج تک نہ جانے ہم کتنی درجن بیویوں کے مالک ہوتے۔ ہمارے حرم میں ملک ملک کی بیگمات ہوتیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ بیگمات کی ایک یو این او UNO ہوتی اور نہ جانے ہمارے جسم و جان کا کیا حشر ہوتا۔ اب آپ سے کیا پردہ۔ ہم تو بڑی مشکل سے ایک عدد بیوی اور تین بچوں کے پیٹ پال رہے ہیں۔ اور وہ بھی ہم کیا حقیقت میں آپ ہی پال رہے ہیں۔ ہم تو محض ایک عارضی وسیلہ ہیں لیکن اگر ہم درجنوں بیویوں کے سرتاج اور سینکڑوں ہزاروں قسم قسم اور رنگ رنگ کے بچوں کے والد ہوتے تو شاید ایک میونسپل کمیٹی کا پورا سالانہ بجٹ بھی ہمارے گھریلو اخراجات کے لئے کافی نہ ہوتا۔ اس لئے جہاں تک ہماری ذات پر آپ کی یہ عنایت اور دوسری بے شمار مثبت عنایات کا تعلق ہے ہم آپ کے احسانات تلے اس قدر دبے ہوئے ہیں کہ گردن نہیں اٹھا سکتے۔ ہم پوری ایمانداری سے اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے جن نوازشاتِ عالیہ سے اپنے اس گنہگار عاجز بندے کو نوازا ہے حقیقت یہ ہے کہ ہم اس کے اہل ثابت نہیں ہوئے۔ اے میرے رب ہم اس قدر گنہگار ہیں کہ شاید بحیرہ عرب کا تمام پانی ہمارے گناہوں کی سیاہی نہ دھو سکے۔ ہم گناہوں کی دلدل میں اس قدر پھنسے ہوئے ہیں اور پھر بھی ہم پر آپ کے انعامات کی بارش ہوتی رہتی ہے!! اے میرے رب آپ یقین فرمائیں کہ ہم اسی لئے اٹھتے بیٹھتے آپ کی بڑائی کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔ ہماری ایک ایک سانس آپ کی حمد و ثنا میں مصروف رہتی ہے۔ اس دنیا میں بھی ہم آپ کے ممنون

ہیں۔ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور انشاءاللہ حاضرِ خدمت ہو کر بھی اپنے دِل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کریں گے اور اس مقصد کے لئے جلد ہی آپ کے دربار میں حاضری کی اجازت چاہیں گے۔ ویسے بھی ہمارا یہ احساس بڑی شدت سے بڑھتا جا رہا ہے کہ اب ہم بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جس رفتار سے ہماری عمرِ عزیز بڑھتی جا رہی ہے اس رفتار سے ہم ۲۰۸۰ء میں ایک سو بیالیس سال کے ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ کیا جئیں گے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ اب ویسے بھی ہمارا اس دنیا میں جی نہیں لگتا۔ جس کے سب ساتھی بچھڑ چکے ہوں اس کے لئے اس خودغرض دنیا میں پھر کیا چارم باقی رہ جاتا ہے۔ ہمارے گروپ میں شکسپیئر اور غالب باقی رہ گئے تھے وہ بھی کچھ عرصہ ہوا ہم سے جُدا ہو چکے ہیں۔ اب پرانے ساتھیوں میں فیض احمد فیض اور ہم باقی رہ گئے ہیں اور فیض بھی اکثر بیمار اور ملک سے باہر اپنا غم غلط کرتے رہتے ہیں اس لئے صرف ہم ہی ہم باقی رہ گئے ہیں۔ ایسے میں یہاں ویرانے میں کس کا جی لگ سکتا ہے۔ اس لئے ہم خود بھی جلد از جلد یہ جہانِ فانی چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ لہٰذا جلد ہی یعنی ۲۰۸۰ء یا اس کے صرف چند ہی سال بعد حاضرِ خدمت ہو جائیں گے اور آپ نے اپنے اس حقیر بندے پر جو عظیم احسانات کئے ہیں ان کا بنفسِ نفیس شکریہ ادا کریں گے۔

لیکن گستاخی معاف۔ جہاں تک اس ارضِ پاک کا تعلق ہے جہاں کہ ہم رہتے ہیں بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ ہمیں بھولتے جا رہے ہیں۔ ہم تو پاکستان کے قیام ہی کو آپ کے نام منسوب کرتے ہیں اسی لئے اسے مملکتِ خداداد پاکستان کہتے ہیں۔ اپنا نظامِ حکومت چلانے کے لئے اب تک ہم نے جو بھی آئین بنائے ان میں سب سے پہلے آپ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعتراف کیا اور کہا کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ہی پوری کائنات کا بلاشرکت غیرے حاکم مطلق ہے۔ اس لئے جب ہم ہر بات میں آپ کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کرتے ہیں اور کسی ایک بڑی طاقتوں کے محض اس لئے

زیرِ عتاب ہیں کہ مسلمان یعنی آپ کے نام لیوا ہیں۔ تو پھر معاف کیجئے آپ کی طرف سے یوں سرد مہری ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہمارے ملک کے دو ٹکڑے ہو گئے آپ خاموش رہے۔ اب پھر لوگ کہہ رہے ہیں کہ ملک مزید حصّوں میں بٹ جائے گا۔ یہ صوبہ فلاں ملک لے جائے گا۔ اور وہ صوبہ اُس ملک سے جا ملے گا۔ عدم تحفظ کا اس قدر بڑھتا ہوا خوف!! توبہ۔ اے مولا کریم۔ آخر یہ سب کیا ہے؟ کیا ہم نے یہی منحوس دن دیکھنے کے لئے اپنی لاکھوں ماؤں بہنوں کی عصمتیں لٹوائی تھیں؟ ہم ناشکرہ گزاری کے جرم کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے لیکن بصد احترام یہ ضرور گزارش کریں گے کہ ہماری ذات پہ آپ کی عنایات کا کیا فائدہ جبکہ ہماری اس پاک سرزمین کو یوں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ معاف کیجئے ہم کوئی ناخلف بیٹے تو نہیں کہ اپنی مادرِ وطن کی مفلوک الحالی پہ آنسو نہ بہائیں اور آپ سے بصد ادب احتجاج نہ کریں؟ ہمارے اس عدم تحفظ کے بڑھتے ہوئے جاں گُسل احساس کے جواب میں ممکن ہے۔ اے ربِ کعبہ! آپ ارشاد فرمائیں کہ میاں آپ لوگ پہلے اپنے اعمال دیکھیں پھر ہم سے بات کرنے کی جرأت کریں۔ آپ لوگ تو اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ آپ کلمہ گو مسلمان ضرور ہیں لیکن اعمال کے لحاظ سے ملحد اور کافر بھی آپ سے بہتر ہیں۔ ملک کو خود آپ لوگوں نے توڑا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں نے تو ملک توڑنے والے کچھ کرداروں کو سزا دے دی ہے۔ اور وہ بھی اس انداز سے کہ وہ کردار دوسروں کے لئے عبرت کا سامان بن گئے ہیں۔ کوئی تصور مجھ سے بچ کر نہ جا سکے گا۔ ماضی میں ایسا ہوا ہے اور نہ ہی مستقبل میں ایسا ہو گا...... لیکن اے عزیز من۔ آپ لوگ بھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہ کیا آپ کسی بھی لحاظ سے میرے انعام و کرام کے مستحق ہیں؟ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ آپ سب کو ابابیلوں سے سنگسار کروا دوں یا پتھروں میں تبدیل کر دوں تاکہ دوسرے مسلم ممالک آپ سے عبرت حاصل کریں۔ آپ کس لحاظ سے مجھ پر یہ الزام لگا سکتے ہیں کہ میں اس نام نہاد مملکتِ خداداد پاکستان کو نظر انداز کر رہا ہوں؟

اے میرے اللہ۔ اے دو جہان کے مالک ۔ آپ اگر چاہیں تو آپ مندرجہ بالا مؤقف اختیار کر سکتے ہیں اور آپ یہ مؤقف اختیار کرنے میں حق بجانب بھی ہونگے اس وسیع و عریض کائنات میں ہماری حیثیت ہے ہی کیا۔ بے شک ہم صراطِ مستقیم سے بھٹک چکے ہیں۔ ہماری آنکھوں پہ پردہ پڑ چکا ہے ہم کچھ بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ہم بہرے ہو چکے ہیں ہم کچھ بھی نہیں سن سکتے۔ ہم گونگے ہو چکے ہیں ہم کچھ بھی بول نہیں سکتے۔ اے رب ذوالجلال۔ آپ کی مخلوق تو ہیں لہٰذا مجھے یقین ہے آپ ایسا سخت مؤقف اختیار نہیں کریں گے۔ (ویسے جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ "کچھ لو۔ کچھ دو" کی یہ پالیسی خالقِ کائنات کا نقطہ نظر نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ہونا چاہیئے) آپ کہ رب ہیں، ستّار ہیں، رحمٰن اور رحیم ہیں ہماری کوتاہیوں اور غلطیوں کو معاف فرمائیں۔ مسلمان اور خاص طور پر ہم پاکستانی دنیا میں مذاق کا موضوع بنتے جا رہے ہیں۔ لوگ ہم پہ ہنستے ہیں معاف کیجئے یہ صورت حال نہ ہمارے لئے اچھی ہے نہ آپ کے لئے ـــــ بے شک اصلاحِ احوال کے لئے کوشش کرنا ہمارا فرض ہے لیکن کوشش کی توفیق بھی تو آپ ہی عطا فرمائیں گے ـــــ پانی اب سر سے اونچا ہونے کو ہے۔ اے ربِ کعبہ ہمیں ڈوبنے سے بچالے۔

ہم محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے کندھوں پہ کچھ گدگدی سی ہو رہی ہے۔ شاید انسان سوار بے وزن فرشتے سگنل دے رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو یوں لمبے لمبے خط نہیں لکھتے۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ عقلمند کے لئے اشارہ کافی ہوتا ہے اور ماشاءاللہ آپ تو اللہ تعالیٰ ہیں۔ رحمت علی چوہدری بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم جب بھی کچھ لکھنے بیٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ لکھنے والا کس موضوع پہ لکھنے بیٹھا ہے۔ خط کا طول و عرض یعنی مطلع اور مقطع کیا ہوگا۔ لہٰذا ہم اپنے جلے دل کا حال اور کھل کر نہیں لکھتے اور اسی امید پہ اپنا یہ کھلا خط ختم کرتے ہیں کہ آپ ہمیں ذلت کے گڑھوں

سے نکلنے کے لئے اب "کُن" وغیرہ کہہ دیں گے۔

آخر میں ہم یہ کہنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ اگر خط کی تحریر میں ہم نے کوئی ایسا لفظ نادانستہ طور پر لکھ دیا ہو جو خدانخواستہ کسی بھی لحاظ سے آپ کی شان میں گستاخی کے مترادف ہو تو ہم معافی کے خواستگار ہیں۔ لیکن فلسفۂ چوہدری رحمت علی کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو ہم نے آپ کو خط لکھنے کے لئے جب قلم اٹھایا ہوگا تو قلم نے آپ سے ضرور پوچھا ہوگا "سر کیا حکم ہے۔ لکھنا شروع کروں یا نہیں"؟ جب قلم نے لکھنا شروع کر دیا تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قلم نے جو کچھ لکھا آپ کی اجازت ہی سے لکھا ہوگا۔ لہٰذا ایسے میں ہماری غلطی کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ کے ایک عاجز اور گنہگار بندے کی حیثیت میں ہم آپ سے غیر مشروط معافی کے طلبگار ہیں۔

سننے پڑھنے والوں کو سلام۔ براہِ کرم کسی مناسب موقع پر عزرائیل صاحب کے نوٹس میں بھی ہماری یہ خواہش لے آئیں کہ ہم آپ سے جلد ملنا چاہتے ہیں لہٰذا وہ ۲۰۸۰ء میں دوسری مصروفیات سے کچھ وقت ہمارے لئے بھی نکال لیں اور ہمیں آپ کے حضور پیش کرنے کے لئے خاطر خواہ انتظام کر رکھیں۔ برادرم اسرافیل صاحب کو بھی مطلع ہو کہ وہ ۲۰۸۰ء سے پہلے اپنا صُور نہ پھونکیں۔ اگر اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود اس بگل کو ابھی تک زنگ نہیں لگا تو مزید سو ڈیڑھ سو سال میں کیا فرق پڑ جائے گا۔ دوسرے برادر فرشتوں کو بھی ہمارا مخلصانہ سلام کہہ دیں۔

آخر میں التماس ہے کہ براہ کرم اس خط کو خط نہیں تار سمجھیں۔

آپ کا گنہگار بندہ

زاہد ملک

ہماری چند نادر کتابیں

۱۔ مضامینِ قرآنِ حکیم — زاہد ملک
قیمت ۱۵۰ روپے

۲۔ قرآن اور ادیب — زاہد ملک
قیمت ۲۵ روپے

۳۔ اسلامی حدود و تعزیرات — ڈاکٹر طفیل احمد قریشی
قیمت ۵۰ روپے

۴۔ مکاتیبِ رسول ؐ — عزیز ملک
قیمت ۲۰ روپے

۵۔ خطباتِ رسول ؐ — پروفیسر امتیاز سعید

۶۔ بلال حبشیؓ — عزیز ملک
قیمت ۲۰ روپے

شعبۂ ادبیات کی کتابیں

۱۔ ۱۹۸۰ء کے منتخب افسانے — فتح محمد ملک / محمد منشا یاد
قیمت ۴۰ روپے

۲۔ ۱۹۸۰ء کی منتخب غزلیں — ناصر زیدی
قیمت ۲۵ روپے

۳۔ بحضرتِ دوست — محمد سعید
قیمت ۳۵ روپے

۴۔ پطرس — ایک مطالعہ — کرنل غلام سرور
قیمت ۴۰ روپے

زیرِ طبع کتابیں

۱۔ خلاصہ مطالبِ قرآن
مؤلف: جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن

۲۔ مضامینِ احادیثِ نبویؐ
مجلسِ ادارت

۳۔ قرآن — ایک نظر میں
مؤلف: محمد میاں صدیقی

۴۔ حیاتِ طیبہ — ایک نظر میں
مجلسِ ادارت

۵۔ نماز — بچوں کے لئے
مجلسِ ادارت

۶۔ علماء ڈائریکٹری
مرتبہ: محمد میاں صدیقی

۷۔ مضامینِ قرآنِ حکیم (انگریزی ایڈیشن)

۸۔ نیا طرزِ احساس
مصنف: فتح محمد ملک

مطبوعاتِ حرمت